سید امجد حسین

اعجاز القرآن

ایک تنقیدی مطالعہ

جرات تحقیق

www.RealisticApproach.org

اعجاز القرآن

ایک تنقیدی مطالعہ

سید امجد حسین

جرات تحقیق

بااشتراک

پاکستانی فری تھنکرس، فیس بک

جملہ حقوق محفوظ

علمی اور تحقیقی امور نیز

مباحث کے لیے اقتباسات کی

نقل کی اجازت ہے

لیکن اس کتاب کا معقول حوالہ شرط ہے۔

Jurat-e-Tehqiq

مندرجات

مقدمہ

زبان: عجز یا اعجاز

- کیا کوئی زبان معجزہ کے درجہ پر فائز ہو سکتی ہے؟

عربی زبان اور اس کا رسم الخط

- عربی زبان اور اس کے رسم الخط کا پس منظر
- عربی رسم الخط کی خامیاں

کلام اللہ کی حقیقت

- کلام اللہ سے مراد
- یہودیوں کی تقلید
- قرآن کا چیلنج
- کلام اللہ بنام کلام بشر
- قرآن اور غیر قرآن میں فرق
- قرآن اپنی شہادت دینے سے قاصر

قرآن اور اہل عرب کی فصاحت وبلاغت

- کیا اہل مکہ کی نگاہ میں قرآن عجوبہ تھا؟
- قرآن کو سحر کیوں کہا گیا
- قرآن سے لفظ "سحر" کی سند

مکہ میں قرآن کی تحدی

اعجاز قرآن کی ناکامی

- نضر بن حارث
- مسیلمہ بن حبیب
- اسود عنسی

عہد نبوت کے فصحاوبلغا

- لبید بن ربیعہ
- حسان بن ثابت
- عباس بن مرواس
- نابغہ جعدی
- کعب بن مالک
- کعب بن زہیر
- عبداللہ بن الزبعری

قرآن کی فصاحت پر متاخرین کی رائے

قرآن کے اسلوبی و نحوی نقائص

- فصاحت کیا ہے؟
- بلاغت کیا ہے؟
- قرآن کی بے ربطی
- اہمال کی منطق
- تکرار
- قلت ذخیرہ الفاظ
- قصوں کی تکرار
- سوال گندم، جواب چنا

- ناما نوس الفاظ
- فقروں میں سقم
- تضاد بیانی
- اللہ کی قسم
- تخاطب
- قران وو صل
- حشوو زوائد
- محذوف عبارتیں
- نحوی غلطیوں کی کچھ اور مثالیں
- صفت حاضر، اسم غائب

قرآن کی بے نظیری کے اسباب

- قدیم عربی لٹریچر ناپید
- قرآن کی اصلاح

ماٰخذ

مقدمہ

یہ عنوان ایک زمانے سے میرے غور و فکر کا مرکز رہا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ زبان و ادب کے تنقیدی مطالعے سے میرا دیرینہ رشتہ رہا ہے۔ زیر نظر موضوع پر مسلمانوں نے کافی زور آزمائی کی لیکن ان کی ساری کوششیں یا تو محض نرے دعوے پر مشتمل رہیں یا پھر شاعرانہ مبالغہ آمیزی پر۔ حالاں کہ زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ اس طرح کے مسائل مسجدوں کے حجروں اور راہبوں کی خانقاہوں سے نکل کر سڑک، بازار، دفتر اور سوشل میڈیا تک پہنچ چکے ہیں۔ کسی بھی متن کے مطالعے کے لیے نئے اصول اور نئے سانچے مرتب ہو چکے ہیں جن سے پرانے اسکول کے زائیدہ ناواقف ہیں۔ اب محض ''عربیت'' کی دھونس جمانے سے بھی کام نہیں چلنے والا، کیوں کہ قرآن جزدانوں سے باہر نکل آیا ہے اور ترجموں میں پڑھا ہی نہیں جاتا بلکہ اچھی طرح سمجھا بھی جاتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ زیر نظر موضوع کا تجزیہ ان لوگوں کی نخوت کو صدمہ پہنچائے جن کا جہل ان کے علم کی بدولت ہے۔

زیر نظر موضوع پر زعمائے اسلام نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، مثلاً ''اعجاز القرآن و البلاغۃ النبویۃ'' (مصطفی صادق رافعی)، ''اعجاز القرآن'' (عبدالکریم الخطیب)، ''اعجاز القرآن الباقلانی'' (بتحقیق السید احمد الصقر)، ''امثال القرآن'' (شمس الدین ابن قیم الجوزیۃ)، ''البرہان فی علوم القرآن'' (بدرالدین محمد عبداللہ زرکشی)، ''بلاغۃ القرآن'' (محمد الخضر الحسین)، ''تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن'' (نعیم الحمصی)، ''تاویل مشکل القرآن'' (ابن قتیبہ)، ''التصویر الفنی فی القرآن'' (سید قطب شہید)، ''الصاحبی فی فقہ اللغۃ و سنن العرب فی کلامہا'' (احمد بن فارس)، ''دلائل الاعجاز'' (عبدالقاہر جرجانی)، ''روح المعانی فی التفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی'' (ابوالفضل شہاب الدین آلوسی)، ''معترک الاقران فی اعجاز القرآن'' (سیوطی)، ''المفردات فی غریب القرآن'' (راغب اصفہانی)، ''من بلاغۃ القرآن'' (احمد احمد بدوی)، ''جمہرۃ البلاغۃ'' (حمید الدین فراہی)، ''البلاغۃ الواضحۃ'' (علی حازم و مصطفی امین)، ''کتاب الصناعتین'' (ابو ہلال الحسن بن عبداللہ)، ''لسان العرب'' (ابن منظور)، ''الفاظ القرآن'' (فقیر اللہ لاہوری)، ''بیان القرآن'' (اشرف علی تھانوی)، ''لغات القرآن'' (عبدالرشید نعمانی و عبدالدائم جلالی) وغیرہ وغیرہ۔ ایک طویل فہرست

ہے لیکن چونکہ میری فہرست سازی میں کبھی دلچسپی نہیں رہی، اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان تمام کتابوں میں دلائل کے اسلحے وہی پرانے ہیں یعنی لغت، صرف و نحو، معانیٔ بیان، الفاظ غربیہ اور عروض و قافیے وغیرہ۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''ادب الجاہلی'' میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ''کیا وہ ادب، ادب کہا جا سکتا ہے جس کو پڑھانے والے وہ لوگ ہوں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہ ہو اور جو یہاں بھی ویسی ہی تقلید روا رکھتے ہیں جیسی فقہ میں کی جاتی ہے بلکہ فقہ میں تو تقلید، علم فقہ سے واقفیت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور ادب میں تقلید کی بنیاد جہالت اور ادب سے ناواقفیت پر ہوتی ہے۔''

آپ کیسے قرآن کے اعجاز پر گفتگو کر سکتے ہیں اور اسے بہترین فن پارہ ثابت کر سکتے ہیں، جب کہ آپ نے ابھی تک جاہلیہ کی بہت ساری کتابوں اور اسلام کی قدیم عبارتوں یا نسخوں کو نہ تو تلاش کیا اور نہ ہی ان کی تشریح و تحقیق کی ہے؟ آپ کیوں کر قرآن کے ادبی محاسن پر گفتگو کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں، جب کہ عربی زبان کے فہم و ادراک کے بارے میں اب تک کوئی ایسی کتاب مرتب نہیں ہوئی جس طرح دوسری قدیم اور جدید زبانوں کے اصول مرتب ہو چکے ہیں، حتیٰ کہ عربی زبان کی نحو اور صرف بھی اس طرح مرتب نہیں ہوئی، جس طرح دوسری نئی اور پرانی زبانوں کی نحو اور صرف مرتب ہو چکی ہے۔ قرآن کے اعجاز پر صفحات کے صفحات سیاہ کرنے والوں نے کسی ایسی تاریخی لغت کی ضرورت تک کو محسوس نہیں کیا جو الفاظ کے ان انقلابات کو ظاہر کر سکے جو متعلقہ الفاظ کے مختلف معنوں پر دلالت کرنے کے سلسلے میں ہوئے ہیں تاکہ آپ قرآنی عبارتوں کو صحیح طور پر اسی مفہوم کے ساتھ سمجھ سکیں، جس مفہوم میں اس کے پیش کرنے والے نے وہ پیش کی تھی، نہ کہ اس مفہوم میں جو موجودہ لغت کی معجون مرکب کتابوں کی روشنی میں ان عبارتوں سے سمجھا جاتا ہے اور جن پر آپ اپنی ادبی تحقیق کے سلسلے میں بھروسہ کرتے ہیں۔ پھر خود عربی ادب کے بارے میں آپ کو کتنا علم ہے، جب کہ عربی ادیبوں، شعرا اور علما کی شخصیتیں اب تک ہمارے لیے غیر معروف ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے، جتنا ''کتاب الاغانی'' یا تذکروں اور طبقات کی دوسری کتابوں نے جمع کر دیا ہے۔ عرب کی فنی اور ادبی تاریخ اب تک گمنامی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب تک یہ کوششیں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتیں اور جب تک متعدد اور متفرق نتائج علمیہ اخذ نہیں کیے جاتے، اس وقت تک قرآن کے ادبی محاسن اور اس کے اعجاز پر گفتگو کرنے والے کسی بھی شخص کا دعویٰ پایہ اعتبار تک نہیں پہنچ سکتا، ورنہ ایسے شخص کو آپ کیا سمجھیں گے جو اس چیز کی

تعریف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو جس سے وہ خود ناواقف ہو؟

ذرا کسی ایسے نابغہ کے بارے میں تصور کریں جو عربی زبان و ادب پر کامل مہارت رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو لیکن دوسری زبانوں کے ادب سے قطعاً ناواقف ہو اور نہ ہی وہ زبان کی تاریخ اور ادب کے مختلف ادوار کے متعلق مختلف طریقہ بحث سے واقفیت رکھتا ہو۔ پھر کسی ایسے عربی ادب کے ثناخواں کا تصور کیجیے جو عربی ادب ہی سے ناواقف ہو، نہ اسے سمجھ سکتا ہو اور نہ اس کے اسرار و نکات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مدرسوں کا حال تو اور بھی برا ہے۔ جس طرح قدما؛ لغت، نحو، صرف، معانی، بیان، الفاظ غربیہ اور عروض و قافیے پر پوری توجہ صرف کرتے ہوئے ادب کا درس دیتے تھے، کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عربی ادب کے اصل ماخذ سامی زبانوں اور ان کے ادب، یونانی اور لاطینی زبانوں اور ان کے ادب، اسلامی زبانوں اور ان کے ادب اور جدید مغربی زبانوں اور ان کے ادب پر پورا عبور رکھتے ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ توریت اور انجیل کو پڑھے بغیر آپ عربی ادب سے پوری طرح واقف ہو سکیں؟ لیکن کیا آپ کسی مدرسے کے معلم کے بارے میں یہ خوش گمانی رکھ سکتے ہیں کہ وہ توریت اور متعدد انجیلوں میں سے کسی ایک انجیل کو بھی اصل زبان میں پڑھ چکا ہو؟ قرآن کے ادبی اعجاز پر لفاظی کرنے والے علما اور ان کے مقلدین میں سے کتنے ایسے ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ عربی زبان و ادب پر روم اور یونان کے تمدنی اثرات کیوں کر مرتب ہوئے۔ قرآن کے ادبی محاسن پر لفاظی کرنے والے کتنے مصنفین کے متعلق آپ یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ انھوں نے ہومر کی ''Iliad'' اور ورجل کی ''The Aeneid'' پڑھی ہو؟ پھر ان سے یہ توقع فضول ہے کہ انھوں نے Sophocles, Aristophanes, Shakespeare, Tolstoy وغیرہ کو بھی پڑھا ہو۔ کلاسیکی ڈرامے، نغمے، تقریریں، مکتوبات اور اہل زبان کے مکالمے وغیرہ تو خیر ان کی دسترس سے کافی دور ہیں۔ یونان اور روم کے ادب عالیہ کو چھوڑیے، ان میں سے کتنوں نے فردوسی کا ''شاہنامہ'' یا عمر خیام، سعدی اور حافظ کے کلام کا بھی کچھ مطالعہ کیا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم قرآن کے ادبی اعجاز پر گفتگو کریں اور اسے اب تک کی تمام زبانوں کے ادب پر مقدم رکھیں لیکن یورپ کی زندہ زبانوں تک ہماری رسائی تک نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم زبان و ادب کی تحقیق کے جدید طریقوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف قرآن پر اکتفا کریں اور اس کے سر پر اعجاز کا تاج سجا دیں؟

عربی زبان و ادب کو مقدس قرار دینے کا سبب سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ قرآن و سنت اسی زبان کی رہین منت ہیں اور قرآن کو اعجاز کے مرتبہ پر فائز کرنے کا مقصد علما کے نزدیک سوائے اس

کے اور کچھ نہیں رہا کہ وہ اسلام کے مبلغ بننا چاہتے تھے تاکہ الحاد و دہریت کی بیخ کنی کر سکیں۔ان میں سے کسی کا عربی زبان و ادب کی تحقیق و مطالعہ سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں رہا۔اس کے علی الرغم ادب ہمیشہ آزادی کا محتاج ہوتا ہے۔ضرورت اس بات کی تھی کہ قرآن کے ادبی محاسن پر گفتگو کرتے ہوئے اس پر سے تقدیس کا گھونگھٹ ہٹا دیا جائے اور بحث، نقد، تحلیل، شک، انکار اور تردید کی بارگاہ کے دروازے کھول دیے جائیں تاکہ نتائج غیر ذمہ دار ثابت ہوں۔یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج تک قرآن احترام اور تقدیس کی گرفت سے آزاد ہونے کا محتاج ہے، وہ اس بات کا آج بھی ضرورت مند ہے کہ وہ محققین اور اہل زبان کا سامنا ویسے ہی کرے، جس طرح پڑھے لکھے لوگوں کے تجربہ گاہ میں مادہ پیش ہوتا ہے۔میرے خیال میں جس دن قرآن احترام و تقدیس کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے گا، اس دن صحیح معنوں میں قرآن کے ادبی پہلوؤں پر ایک صحت مند مکالمے کی راہ استوار ہو جائے گی۔

قرآن کو احترام و تقدیس کی گرفت سے آزاد کرنا، خود اسی کے حق میں ہے، اس پر جز بز ہونے کی ضرورت نہیں۔زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، عہد وسطیٰ کا وہ زمانہ یاد کیجیے، جب انسانی جسم کی تشریح جائز نہیں تھی کیوں کہ انسانی جسم ایک مقدس چیز ہوا کرتی تھی، اسے اس طرح چھوا تک نہیں جا سکتا تھا کہ اس کی توہین ہو جائے۔آپ کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ علم تشریح الابدان، علوم طب، فن تصویر کشی اور بت تراشی میں انسانی جسم کا کتنا زیادہ دخل ہے۔پھر آپ کو وہ دن بھی یاد دلانے کی ضرورت نہیں، جب جسم انسانی کو تحقیق اور مطالعے کے لیے استعمال میں لانے کی اجازت مل گئی۔اس اجازت نے علوم طبیعیہ اور فنون طبیہ پر کیا اثر ڈالا، یہ شاید مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔یہی حال زبان و ادب کا بھی ہے، ادبی اور لغوی علوم اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتے جب تک انھیں احترام و تقدیس کی گرفت سے آزاد نہ کیا جائے۔

اعجاز قرآن یا قرآن کی فصاحت و بلاغت پر لیکچر جھاڑنے والوں کے نزدیک آج بھی عربوں کی تقسیم؛ عرب بائدہ، عرب باقیہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی طرف کی جاتی ہے۔آج بھی فلاں شاعر اولاد جرہم سے تعلق رکھتا ہے اور فلاں اولاد اسماعیل سے، آج بھی امرأ القیس "قفا نبك من ذكرى" کا کہنے والا ہے اور عمرو بن کلثوم "الاهبى بصحنك" کا کہنے والا۔آج بھی جاہلیت اور اسلام کے زمانے کے کلام عرب کی تقسیم، نثر اور نظم، پھر نثر کی تقسیم نثر مرسل اور مسجع کی طرف کی جاتی ہے۔ایسے لوگ متقدمین کے ارشادات کو بہ رضا و رغبت تسلیم کر لیتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ان کے فقہا اور متکلمین نے فقہ اور کلام میں اجتہاد کے دروازے بند کر دیے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جنھیں ایمان بالغیب کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، وہ متقدمین کے تمام مفروضات اور مسلمات سے خالی الذہن ہو کر بنیادی سوالوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ فرزدق نے سجدہ کیا، ابوجہل چھپ کر قرآن سنتا تھا، کس مشرک اور کافر نے قرآن کے ادبی محاسن کی تعریف کی، کس کس نے قرآن کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا وغیرہ وغیرہ، بلکہ ان لوگوں کو یہ ماننا ہے کہ یہ سب متقدمین کا فرمایا ہوا ہے جس کی جانچ پڑتال ضروری ہے کہ یہ کہاں تک قیاس ہیں اور کہاں کہاں ان مفروضات میں غلطیاں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ کافی پیچیدہ اور لازمی طور پر خطرناک ہے۔ یہ طریقہ کار ایک قسم کے انقلاب یا بغاوت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ وہ تمام باتیں جنھیں دنیا آج تک بے چون وچرا تسلیم کرتی چلی آئی تھی، دفعتاً شک اور شبہے کی نظروں سے دیکھی جانے لگیں۔ وہ تمام مسلمات جو ناقابل تردید سمجھے جاتے تھے، وہ اچانک ناقابل یقین ٹھہرائے جانے لگے۔

ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ علمائے کرام نے قرآن، حدیث اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی لفظی اور معنوی تشریح میں جاہلی اشعار کو سند اور شہادت کی اصل قرار دیا ہے۔ حیرت یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو اس سند و شہادت کی تلاش میں کوئی محنت و مشقت بھی اٹھانی نہیں پڑتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا قرآن و حدیث کی ضرورت اور ناپ سے یہ اشعار سیے گئے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح پہننے والے کی ناپ سے کپڑا بیونتا جاتا ہے جو گھٹتا بڑھتا نہیں ہے۔ ایک روایت ہے:

"ایک شخص ابن عباس کے پاس گیا، اس کے پاس کچھ سوالات تھے، قرآن کے لغات سے متعلق، جن کی تعداد دو سو سے اوپر تھی۔ اس نے باری باری سوال کرنا شروع کیا۔ جب ابن عباس اس کے سوال کا جواب دیتے تھے تو وہ پوچھتا تھا کہ اس بارے میں آپ کو کچھ عربی اشعار بھی یاد ہوں تو سنا دیجیے۔ ابن عباس کہتے، ہاں امراؤالقیس کہتا ہے... عنترہ کہتا ہے... فلاں شاعر کہتا ہے... اور فلاں شاعر کہتا ہے..."

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب میں اس روایت پر شبہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ابن عباس اور نافع ابن الازرق کا یہ قصہ بھی ان مختلف اغراض میں سے کسی غرض کے تحت گڑھ لیا گیا ہو، جو گڑھنے اور اور اپنی طرف سے اضافے کا سبب ہوا کرتے ہیں؟ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن کے تمام الفاظ فصیح عربی زبان کے مطابق ہیں، یا یہ ثابت کرنے کے لیے عبداللہ بن عباس قرآن کی تاویل و تشریح میں نیز جاہلیت کے کلام کے حفظ میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔" (ادب الجاہلی)

سب سے پہلے تو میں یہ واضح کر دوں کہ آج تک جس کو ہم "جاہلی ادب" کہتے رہے ہیں، اس کے اکثر و بیشتر حصے کا جاہلی ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ظہور اسلام کے بعد بڑھایا گیا ہے۔ دراصل وہ اسلامی ادب ہے جس میں زمانہ جاہلیت کے میلانات سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے میلانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اصلی جاہلی ادب کا جو کچھ سرمایہ بچا ہے، وہ اس قدر مختصر ہے کہ وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے۔ البتہ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ زمانہ جاہلیت کا وہ دور جو زمانہ اسلام سے متصل ہے، قدرے محفوظ ہے۔

ابن سلام، یونس بن حبیب سے نقل کرتا ہے کہ یونس بن حبیب نے ابو عمرو بن العلا کو یہ کہتے سنا تھا کہ: "جاہلیت کے اشعار میں تمھارے لیے جو کچھ بچا ہے، وہ بہت کم ہے۔ اگر تمھیں ان اشعار کا کافی حصہ مل جاتا تو بہت کچھ علم و ادب تمھارے ہاتھ آجاتا۔"

اشعار گڑھنے اور انھیں شعرائے جاہلیت کی طرف منسوب کرنے میں مذہبی فوائد اور مذہبی جذبات، سیاسی منافع اور سیاسی جذبات سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ یہ صرف آخری دور کی بات نہیں ہے بلکہ بنی امیہ کے دور میں بھی یہ مذہبی جذبہ کام کرتا رہا اور شاید مذہب کے زیر اثر اشعار گڑھنے کا دور درجہ بہ درجہ خلفائے راشدین کے عہد تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ مذہب کے زیر اثر اضافے اور الحاق کی ایک پوری داستان ہے جسے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

اکثر یہ اضافے نبوت کی صحت اور پیغمبر اسلام کی صداقت ثابت کرنے کی غرض سے ہوتے تھے، آپ ان میں ان اشعار کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو روایت کرنے والوں کی روایت کے مطابق ایام جاہلیت میں کہے گئے ہیں اور جن میں بعثت نبوی کی تمہید قائم کی گئی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ان اشعار میں ایسی خبریں اور داستانیں بھی بیان کی گئیں جن سے عوام کو یہ اطمینان دلایا جاسکے کہ عرب کے پڑھے لکھے لوگ، نجومی، یہودیوں کے علما اور عیسائیوں کے دینی پیشوا سب کے سب ایک ایسے پیغمبر کی بعثت کے منتظر تھے جو قریش کی نسل یا مکہ کے باشندوں میں سے ہو گا۔ سیرت ابن ہشام اور دوسری سیرت کی کتابوں میں اس قسم کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ بعض اشعار جنات سے بھی منسوب ہیں کیوں کہ یہ مشہور ہے کہ عربی قوم صرف انسانوں کی قوم نہیں تھی بلکہ ایک دوسری قوم جنات کی بھی تھی اور وہ اشعار بھی کہتی تھی۔ قرآن میں ایک سورۃ ہے سورہ جن، جو ہمیں بتاتا ہے کہ جنات نے پیغمبر اسلام کو قرآن کی تلاوت کرتے سنا تو ان کے دل پسیج گئے اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ان جنات کا تسلط صرف معاشرتی اور ادبی زندگی میں نہیں بلکہ سیاسی زندگی میں بھی تھا۔ سعد بن عبادہ کے قتل کی داستان کسے نہیں معلوم، جنھوں نے قریش کی

خلافت کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا، اور راویوں کے مطابق ان کو ایک جن نے قتل کر ڈالا تھا۔ روایت کرنے والے اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ کچھ اشعار بھی روایت کرتے ہیں جو سعد بن عبادہ کے قتل پر فخریہ انداز میں اس جن نے کہے تھے۔

اشعار گڑھنے اور انھیں شعرائے جاہلیت کی طرف منسوب کرنے کی ایک اور دوسری وجہ بھی تھی، جو قریش کے اندر پیغمبر اسلام کی خاندانی وجاہت اور نسبی شرافت کی اہمیت سے وابستہ ہے۔ لوگ اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ پیغمبر اسلام کو بنی ہاشم میں پاک تر اور بنی ہاشم کو بنی عند مناف میں، بنی عبد مناف کو بنی قصی میں، قصی کو قریش میں، قریش کو مضر میں اور مضر کو عدنان میں اور عدنان کو عرب بھر میں پاک تر ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا، عبداللہ، عبدالمطلب، ہاشم، عبد مناف اور قصی کی طرف ایسے واقعات اور ایسے امور منسوب کرنا شروع کر دیے گئے جن سے ان کی شان اعلیٰ اور ان کا درجہ ارفع ہو جائے اور اپنی قوم پر بالخصوص اور اہل عرب پر بالعموم ان کی برتری ثابت ہو جائے۔ یہ قصہ کافی طویل ہے، مجھے ڈر ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے میں موضوع سے دور جا پڑوں گا۔ مختصر میں اتنا جان لیجیے کہ جب عربوں میں علمی زندگی کا ظہور ہوا تو غلام قوموں نے قرآن کی لغوی تشریح کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہی اور قرآنی الفاظ و معانی کی صحت کے لیے ثبوت جمع کرنا چاہے۔ کسی خاص ضرورت کے تحت انھیں اس بات کو ثابت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی کہ قرآن عربی زبان کی کتاب ہے اور اس کے الفاظ عرب کی بول چال کے مطابق ہیں، چنانچہ قرآن کے ایک ایک لفظ کے لیے عربی اشعار سے وہ سند ڈھونڈنے پر آمادہ ہو گئے کہ قرآن کا فلاں لفظ عربی زبان کا ہے اور اس کی عربیت میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک کی وجہ صاف تھی کہ علما اور بطور خاص غلام قوموں کے اصحاب تاویل اکثر موقعوں پر قرآن کے سمجھنے اور اس کی عبارتوں کی تاویل پر متفق الرائے نہیں ہو سکے، لہٰذا ان کے درمیان تاویل اور تفسیر میں اختلافات پیدا ہو گئے اور انھی اختلافات سے فقہا اور اصحاب تشریع کے درمیان دوسرے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ علما کے درمیان جو اختلافات ہوتے تھے، ان کا اچھا خاصا اثر ایک عالم کے مرتبے، اس کی شہرت اور عوام میں اس کی مقبولیت اور اس کے علم پر خلفا و امرا کے اعتماد کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ یہیں سے ان علما میں یہ ذوق و شوق پیدا ہوا کہ وہ اپنے اختلاف میں ہمیشہ فاتح کہلائیں اور جو کچھ رائے وہ رکھتے ہیں، اس میں خود کو حق اور صواب سے قریب تر ظاہر کریں۔ ان کی یہ خواہش ایسے اشعار سے سند لانے کی وجہ بنی جو قبل نزول قرآن عربوں نے کہے ہوں۔ معتزلہ اپنا عقیدہ جاہلی ادب کے اشعار سے ثابت کرتے ہیں، دوسری طرف غیر معتزلہ بھی ان کی تردید جاہلیہ کے عرب شعرا کے اشعار سے ہی

کرتے ہیں۔ اگر آپ جاحظ کی "کتاب الحیوان" کا مطالعہ کریں گے تو اس قسم کے الحاق اور اضافے کے اتنے نمونے آپ کو نظر آجائیں گے کہ مجھے اپنے موقف کی تصدیق کے لیے کسی دوسرے ماخذ کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

آپ متحیر رہ جائیں گے، اگر ایسے اشعار کی کثرت تعداد کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ صرف ابن ہشام کی سیرت ہی سے اشعار کے کئی دیوان تیار ہو سکتے ہیں۔ بعض اشعار جنگ بدر کے متعلق کہے گئے ہیں، بعض جنگ احد کے متعلق اور بعض دیگر واقعات اور مقامات کی مناسبت سے۔ اور یہ سارے اشعار نامور شاعر یا غیر شاعر حضرات کی طرف منسوب ہیں۔ بعض حضرت حمزہ کی طرف منسوب ہیں، بعض علی کی طرف، بعض حسان اور بعض کعب بن مالک کی طرف۔ بعض تو قریش کی شعرا کی طرف منسوب ہیں اور بعض ایسے لوگوں کی طرف منسوب ہیں جنھوں نے کبھی بھی کوئی شعر نہیں کہا ہو گا۔

ابن سلام نے "طبقات الشعرا" میں ہمیں بتایا ہے کہ کسی بھی شاعر کے سر اس قدر اشعار نہیں تھوپے گئے ہیں جتنے حسان بن ثابت کے سر۔ "لیکن مجھے اس پر کلام ہے، کیوں کہ جب آپ سیرت ابن ہشام، غزوات، فتوحات اور خانہ جنگیوں کے موضوعات پر جو کتابیں ہیں، انھیں پڑھیں گے تو آپ جان پائیں گے کہ اس دور کے اکثر شعرا کے سر اسی قدر اشعار تھوپے گئے جس قدر خود حسان بن ثابت کے سر۔

بات طویل ہو جائے گی، اس لیے میں اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یونانی اور لاطینی ادب پر ہزاروں کتابیں یورپ میں شائع ہوئیں اور اب تک ہو رہی ہیں۔ آپ ان میں سے کوئی ایک کتاب اٹھا لیجیے اور اسے پڑھنے کے بعد خود اپنے آپ سے پوچھیے کہ ان دونوں قوموں کے ادب کے متعلق ان مسلمات کا کتنا حصہ باقی رہا ہے جن پر قدما عقیدہ رکھتے تھے؟ کیا "ایلیڈس" اور "اوڈیسی" کے بارے میں آج قدما کے عقیدے قابل تسلیم گردانے جاتے ہیں؟ کیا ہومر اور یونان و روم کے دیگر کلاسیکل شعرا کے بارے میں آج بھی ناقدین ادب کی وہی رائے ہے جو قدما کی تھی؟ کیا ہیروڈوٹس (Herodotus) کی یونان کی تاریخ اور ٹائٹس لیوس (Titus Livius) کی تاریخ روم ان کتابوں کے مشابہ ہے جو نئے لکھنے والوں نے پیش کی ہیں؟ لیکن اس کے برعکس عربی ادب اور عربی تاریخ کے بارے میں جو کچھ اسحاق اور طبری نے لکھا تھا اور موجودہ عہد کے مورخ اور ادیب جو کچھ پیش کر رہے ہیں، ان میں رتی برابر بھی فرق نہیں ملے گا، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان مورخین اور محققین میں خود اعتمادی مفقود ہے۔

کسی بھی عنوان پر ارتکاز کرنے کا سب سے آسان طریق کار یہ ہے کہ پہلے مقدمات طے کر لیے جائیں تاکہ واضح ہو سکے کہ ہمارا سفر کہاں سے کہاں تک کا ہے؟ ہمیں اس راہ نوردی میں کن کن مسائل سے دو دو ہاتھ کرنے پڑ سکتے ہیں؟ اور وہ کون سے سوالات ہیں جو ہماری راہ میں مزاحم ہوں گے؟ لہٰذا، سب سے پہلے ہم ان سوالوں پر مجملاً ایک نظر ڈال لیتے ہیں جن سے ہمارا واسطہ پڑنے والا ہے اور جن کی انگلی پکڑ کر ہم یہ منزل سر کرنے والے ہیں:

(1) کیا کوئی انسانی زبان کامل قرار دی جا سکتی ہے؟
(2) کیا کسی کلام کو جو اصوات اور حروف کا مرکب ہو، اسے خدا کا کلام کہا جا سکتا ہے؟
(3) الفاظ اور تصورات کے درمیان کیا فرق ہے؟
(4) وحی، الہام اور القا کی حقیقت کیا ہے؟
(5) کیا کسی کلام کی نظیر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے؟
(6) کیا کلام بشر فصاحت وبلاغت میں لاثانی نہیں ہو سکتا؟
(7) کیا فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے کلام بشر کلام خدا کے برابر ہو سکتا ہے؟
(8) کیا قرآن نثر میں ہے؟
(9) نثر اور نظم کیا فرق ہے؟
(10) قرآن نے شعر کی ہجو کیوں کی؟
(11) کیا قرآن کی نظم ونثر طاقت بشری سے خارج ہیں؟
(12) کیا قرآن نے فصاحت وبلاغت کا دعویٰ کیا ہے؟
(13) کیا اہل مکہ کی نگاہ میں قرآن عجوبہ تھا؟
(14) قرآن کی تحدی کس معنی میں کی گئی اور کیوں کی گئی؟
(15) کیا واقعی قرآن مکہ میں اپنا اعجاز ثابت کرنے میں کامیاب رہا؟
(16) حروف مقطعات اعجاز کلام ہونے کی دلیل ہے یا کلمۂ غریب ہیں؟
(17) کیا قرآن اور غیر قرآن میں کوئی واضح فرق موجود ہے؟
(18) کیا صنعت میں اعجاز کی گنجائش موجود ہے؟
(19) عربی رسم الخط کی خامیاں کیا ہیں اور قرآن پر اس کے اثرات کیا پڑے؟
(20) کیا قرآن کے لفظی عیوب بھی معیار بلاغت میں شامل ہیں؟

(21) قرآن کی زبان کی اصلاح کیوں کی گئی؟ کیا کلام الٰہی کی اصلاح طاقت بشری کے موافق ہے؟

(22) کیا قرآن میں موجود انسانوں کے گڑھے ہوئے طویل قصے اور کہانیاں (مثلاً بلقیس اور سلیمان یا اصحاب کہف کا واقعہ وغیرہ) بھی اعجاز گردانے جائیں گے؟

(23) کیا قرآن سے پہلے اس سے زیادہ فصاحت و بلاغت سے پُر کوئی کتاب موجود نہ تھی؟

(24) کیا عہد نبوی میں ہی مخالفین نے قرآن کے چیلنج کا جواب نہیں دیا؟

(25) مخالفین کا کلام کیوں ضائع کر دیا گیا؟

(26) قرآن کو سحر کیوں کہا گیا تھا؟

(27) لفظ 'سحر' کے بارے میں خود قرآن کا کیا موقف ہے؟

(28) کیا اسلام کے تمام فرقے اور تمام پیش رو علما قرآن کی فصاحت و بلاغت کے قائل ہیں؟

(29) کیا اہل عرب کے فصحا و بلغا نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر اسلام قبول کیا؟

(30) اہل عرب کے وہ کون سے فصحا و بلغا تھے جنھوں نے کبھی بھی اسلام قبول نہیں کیا اور کیوں؟

(31) متنبی اور انکار اعجاز قرآن کا معاملہ کیا ہے؟

(32) کیا فصحا نے آیات قرآن کو سجدہ کیا؟

(33) متاخرین نے قرآن کے حق میں کیا کیا گمان کیا؟

(34) زمانۂ حال کے منکرین اعجاز فصاحت کا اس بارے میں کیا کہنا ہے؟

(35) قرآن کی بے نظیری کے اسباب کیا ہیں؟

مندرجہ بالا سوالات کو اس مقدمے کی اساس کہا جا سکتا ہے لیکن جب بات نکلے گی تو بہت دور تلک جائے گی، لہٰذا ان بنیادی سوالات کے بطن میں کئی ذیلی مقدمات بھی پوشیدہ ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے پر جن لوگوں نے اب تک کلام کیا ہے، وہ ناکافی اور غیر تشفی بخش رہا ہے اور ان میں بھی بیشتر تحریریں محض اپنے عقیدے کے دفاع پر مبنی ہیں جو ظاہر ہے کہ مسئلہ کی اصل ماہیت اور اس کی حقیقت کو پرکھنے کے لیے غیر علمی اور غیر سائنٹفک طریق کار ہے۔ اس ضمن میں میری کوشش یہی رہے گی کہ اس عنوان کے تحت میں کسی خاص مکتبۂ فکر کے طالب علم کی حیثیت کی بجائے ایک غیر متعہد متجسس کی طرح یہ مہم سر کروں۔

میں اس بات کا ہرگز مدعی نہیں ہوں کہ میرا علم کامل ہے، نہ میرا اس پر اصرار ہے کہ میرا فرمایا

ہوا حرف آخر ہے بلکہ ہر انسان کی طرح میرے بھی کچھ حدود مقرر ہیں۔البتہ میں اس بات کو پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے مطالعہ سے جو بھی نتائج اخذ کرتا ہوں، وہ پوری دیانت داری اور جانب داری کے ساتھ اپنے قارئین کے روبرو پیش کر دیتا ہوں۔ کوئی ضروری نہیں کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں، لیکن میں آپ سے یہ امید ضرور رکھتا ہوں کہ آپ اس پر کم از کم غیر سنجیدہ رد عمل نہیں دکھائیں گے۔ "قرآن اور اس کے مصنفین" کی اشاعت اور اس کی حیرت انگیز مقبولیت کے بعد مجھے کچھ غیر سنجیدہ لوگوں کی جانب سے ایسے رد عمل نظر آئے جن کا مسئلہ علم و تحقیق کبھی نہیں رہا بلکہ یہ ہمیشہ خود اپنا مسئلہ رہے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی، اگر میری کتاب میں مندرج ایک ایک اعتراض کے پرخچے دلائل و براہین کے اسلحوں سے اڑا دیے جاتے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے لیے بڑی عرق ریزی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ میرے کرم فرماؤں کو "در جواب آں غزل" لکھنے کی جلدی ہوتی ہے تاکہ عام مسلمانوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کیا جا سکے کہ فلاں شخص کو جواب دے دیا گیا۔ لہٰذا ذاتی حملوں اور افترا پردازی سے اس معرکہ کو سر کرنے کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کا اختتام کچھ پرانے مطبوعہ مضامین کے انتخاب پر ہو جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا، لیجیے صاحب بھان متی کا پٹارہ حاضر ہے، اب چاروں طرف سے سبحان اللہ، ماشاءاللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور شتر مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں گاڑ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ شکاری کا ہم نے شکار کر لیا۔

جو لوگ مناظروں کے قائل ہیں اور سوشل میڈیا میں مجھے مناظرے کے لیے للکارتے پھرتے ہیں، میں ان پر واضح کر دوں کہ میں آپ کی دنیا کا بندہ نہیں ہوں۔ میں مناظرے پر نہیں بلکہ مکالمے اور گفتگو پر یقین رکھتا ہوں اور اس سے بھی کہیں زیادہ بڑا رشتہ میرا لکھنے اور پڑھنے سے ہے۔ مناظرہ صرف اپنی انا کی تسکین اور اپنے مقابل کو زیر دست دکھانے کا ایک نہایت ہی گھٹیا ذریعہ رہا ہے۔ آج تک کسی بھی مناظرے سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور نہ ایک دوسرے کے علم و مطالعہ سے استفادہ کرتا ہوا کوئی نظر آیا، بلکہ مرغوں کی لڑائی کی طرح یہاں بھی صرف ہار جیت ہی فریقین کا مطمع نظر ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد معترضین کی جانب سے اسی رد عمل کا اعادہ کیا جائے۔ ایک بار پھر سوشل میڈیا میں کتاب سے زیادہ صاحب کتاب کو نشانے پر رکھا جائے، ایک بار پھر صرف یہ رٹا رٹایا فقرہ دہرا کر کتاب کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان اعتراضات کا متعدد بار جواب دیا جا چکا ہے، ایک بار پھر بھان متی کا کنبہ جوڑا جائے اور کچی پکی تحریروں اور روایتی

قسم کے دلائل سے مزین ایک کتاب بطور جواب پیش کر کے مسلمانوں کے جذبہ انانیت کو تسکین پہنچانے کی کوشش کی جائے اور شاید ایک بار پھر ہر ایرا غیرا مجھے مناظرے کی دعوت دیتا پھرے۔ میں ایسے تمام لوگوں سے پیشگی معذرت کرتا ہوں کہ خاکسار کو نہ تو کبڈی کھیلنے کا شوق ہے اور نہ ہی میری دلچسپی ان دعاوی تحریروں میں ہے جو از کار رفتہ ہو چکی ہیں۔ یوں بھی کام کافی ہے اور وقت کم، اس لیے وہ مجھ سے نظر التفات کی توقع نہ رکھیں، البتہ اگر کسی صاحب علم و دانش نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس کتاب پر کچھ مقدمات قائم کیے تو میں اس کا شکر گذار ہوں گا کہ علم و دانش کا قافلہ یوں ہی آگے بڑھتا ہے۔

میں اس کتاب کی تزئین واشاعت کے لیے "جرات تحقیق" کا شکر گذار ہوں اور کتاب کے مشمولات کو قسطوں میں چھاپنے کے لیے فیس بک کے علمی و تحقیقی گروپ "پاکستانی فری تھنکرز" کا ممنون ہوں۔

سید امجد حسین

6فروری 2017

زبان: عجز یا اعجاز

دنیا میں تمام کتابیں ایک ہی طرح سے وجود میں آئیں، یہ علاحدہ بات ہے کہ کچھ کتابوں کے گرد تقدس کا ہالہ کھینچ کر انھیں بقیہ کتابوں سے ممیز کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک زمانہ تھا جب ویدوں کو صرف برہمن ہی پڑھ سکتے تھے اور کسی دوسرے کی مجال نہیں تھی کہ پاس پھٹک جائے۔ قرآن کی پیشانی پر بھی ''لایمسہ الاالمطھرون'' ثبت کرکے اسے تنقید و محاکے کی کسوٹی سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ہندو پنڈتوں نے جہاں ''اوم'' کی شان میں زمین آسمان ایک کردیا، وہیں مولویوں نے الف لام میم کی عظمت میں ایسی ایسی قیاس آرائیاں کیں کہ الاماں الحفیظ۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز کی بحث میں اس طرح کے مولویانہ طرز استدلال از کار رفتہ ہوچکے ہیں، لہٰذا مولویوں کو اپنا بہت سا پڑھا لکھا بھلانا پڑے گا تاکہ وہ نئی نسل سے ہم کلام ہونے کی قابلیت حاصل کرسکیں۔ اب اس بات کی بھی قطعی کوئی ضرورت نہیں کہ اعجاز قرآن کی تائید یا تردید میں جو کچھ لکھا جائے، وہ مولویوں سے لائسنس حاصل کرکے لکھا جائے۔

کسی متن کے اعجاز اور تقدیس پر غور و فکر کرتے ہوئے جو سب سے پہلا سوال ہمارے ذہن میں اٹھتا ہے، وہ یہ ہے کہ کیا کوئی زبان مقدس ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ متن اپنے اظہار کے لیے کسی نہ کسی زبان کا محتاج ہوا کرتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر زبان انسان کی ایجاد کردہ ہے نہ کہ آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ یہاں پھر ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا انسانی زبان کامل کہی جاسکتی ہے؟ اگر نہیں، تو پھر ظاہر ہے کہ وہ متن کا مافی الضمیر پوری طرح ادا کرنے سے عاجز ہے، پس ثابت ہوا کہ وہ متن جو کسی انسانی زبان کی محتاج ہو، وہ بھی متعلقہ زبان کی طرح ناقص اور نامکمل قرار پائے گی۔ لیکن ٹھہریے، ہم اس مقدمے کو آغاز سے دیکھتے ہیں۔

کیا کوئی زبان معجزہ کے درجہ پر فائز ہوسکتی ہے؟

انسان اپنی زبان کا خالق خود ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان ناقص ہے۔ لارڈ بیکن کہتا ہے، ''انسان کے تصورات لامحدود ہیں لیکن اس کی زبان محدود، اس لیے وہ اپنے خیالات پوری طرح ادا نہیں کرسکتا۔'' بشپ برکلے نے لفظ کو 'معنی کا قید خانہ' بتایا ہے۔ قصہ

مختصر، ہمارے پاس اپنے تصورات اور خیالات کی مکمل ادائیگی کے لیے ناکافی الفاظ ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم ایک لفظ کو اکثر متضاد معنی میں ادا کرتے ہیں، دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لیتے ہیں، سینکڑوں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں، پرانے لفظوں کے اوپر نئے نئے معانی کا ملمع چڑھاتے ہیں، آنکھوں کی جنبش سے ناک بھوؤں چڑھانے سے چہرے اور سر کی حرکات و سکنات سے ان الفاظ کو تقویت بخشتے ہیں۔ ہم ایسا صرف اس لیے کرنے پر مجبور ہیں تاکہ اپنی زبان کی کمی کو پوری کر سکیں لیکن اس کے باوجود ہم اپنے تصورات اور خیالات کو دوسروں تک اس طرح پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں جس طرح وہ ہمارے دل میں ہوتے ہیں۔ زبان کی یہ کوتاہی دیکھ کر بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ انسان کا سکوت، اس کے بیان سے بڑا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے مافی الضمیر کی ایسی تصویر بن جاتا ہے کہ بغیر لب ہلائے، دوسروں پر اپنا مدعا روشن کر دیتا ہے۔

زبان کا دوسرا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں گروہ بندی اور علاقائیت کا دخل کافی ہوتا ہے اور اس کی وجہ صاف ہے کہ زبان بنیادی طور پر ایک سماجی عمل ہے۔ زبان کے بغیر سماج اور سماج کے بغیر زبان کا تصور ممکن نہیں ہے۔ جوں جوں سماج میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، زبان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ سماجی زندگی کے مختلف اعمال اور کوائف زبان کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہیں۔ ایک ہی لسانی سماج یا لسانی تہذیب اپنے اندر مختلف پرتیں رکھتی ہیں۔ بڑے اور چھوٹوں کا آپسی لسانیاتی رویہ، بولیوں کے طور طریقے، عورتوں اور مردوں کی زبان کا فرق مختلف زبانوں کا آپسی ربط یا ذولسانیات (Bilingualism) یا کثیر لسانیت (Multi Lingualism)، اعلیٰ زبان (High Language)، ادنیٰ زبان (Low Language) وغیرہ بدلتے ہوئے سماج میں زبان کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں، انھیں پیدا کرنے کے لیے کسی لیبارٹری کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کے برعکس جو زبان اپنے بولنے والوں کی ضرورتوں کے تحت نہیں بدلتی، وہ جامد ہو جاتی ہے اور ایک دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے، سامنے کی مثال سنسکرت کی ہے۔ گویا سماج کی طرح زبان بھی مائل بہ ارتقا ہوتی ہے اور جو شے ارتقاپذیر ہوتی ہے، وہ مکمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب میڈیم (زبان) ہی مکمل نہیں ہے تو پھر یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ کسی زبان کے متن کو معجزہ قرار دیا جا سکے۔ اعجاز تو تب تسلیم کیا جاتا، جب خدا اپنے بندوں سے ہمکلام ہونے کے لیے کوئی نئی اعجازی زبان خلق کرتا جس کو سب بول سکتے اور سب سمجھ سکتے یعنی ایسی زبان جس میں وہ نقائص نہ ہوں جن سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور مفسرین اور معبروں کو ایسی ایسی حیلہ جوئی کرنی پڑتی ہے کہ ہر تفسیر اور ہر تعبیر ایک دوسرے سے دور جا پڑتی ہے اور

قارئین ان کرشمہ سازوں کا منھ تکتے رہ جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن کو ہی لے لیجیے، جس کے اولین مخاطب پورا خطہ عرب نہیں بلکہ محض ایک قبیلہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خود صحابہ کے زمانے میں قرآن سمجھنا دشوار ہونے لگا تھا۔ عمر فاروق نے اہل مدینہ (ظاہر ہے جن کی زبان بھی عربی ہی تھی)، سے کہا کہ "اگر قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر کچھ دن گذارو، کیوں کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، وہ زبان ان کے ہاں اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔" آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ کی زبان ہوازن قبیلے کی ایک شاخ بنو سعد کی زبان تھی، جس کا اظہار خود ان کے اس اعتراف کے ساتھ ہوتا ہے کہ: "انا اعربکم وانا من قریش ولسان سعد بن بکر" (میں تم جیسا عرب ہوں، اور قریش سے ہوں، اور میری زبان سعد بن بکر (یعنی قبیلہ ہوازن) کے لب و لہجے پر ہے۔) چنانچہ قرآن کی بھی وہی زبان تھی جو محمد کی زبان تھی جسے بعد میں عثمان کے جمع قرآن کے زمانے میں بڑی حد تک قریش کے تلفظ پر لے آیا گیا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ زبان کا دوسرا سب سے بڑا نقص اس میں گروہ بندی اور علاقائیت کا دخل ہے یعنی ایک علاقے کی زبان کو دوسرا علاقہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے قرآن کو پوری دنیا کے لیے نازل کیا تھا، تو کیا وہ مستقبل سے بے خبر تھا کہ عرب سے کافی زیادہ دوسرے علاقوں میں اسے پڑھنے والے ہوں گے؟ کیا اس سے اللہ کی دور اندیشی اور عالم الغیبی پر اثر نہیں پڑتا کہ اس نے عرب کے ایک چھوٹے سے قبیلہ ہوازن کی عربی پر اسے نازل کیا جو پورے خطے کی زبان بھی نہیں تھی؟ ہم سبھی جانتے ہیں کہ آج مسلمانوں کی غالب آبادی کی زبان عربی نہیں ہے اور نہ وہ عرب ہیں۔ مثلاً انڈونیشیا جس کی مسلم آبادی کم و بیش 202 ملین ہے، پاکستان جہاں تقریباً 192 ملین مسلمان بستے ہیں، ایران جہاں 77 ملین مسلمان رہتے ہیں، ترکی جہاں تقریباً 74 ملین مسلمان موجود ہیں اور انڈیا جہاں موخر الذکر دونوں ملکوں سے زیادہ مسلمان یعنی 172 ملین رہتے ہیں، ان کی زبان عربی نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں صرف تیس ایسے ممالک ہیں جن میں رہنے والے مسلمانوں کی زبان کو لب و لہجے کے فرق کے باوجود عربی کہا جا سکتا لیکن جن کی کل آبادی مجموعی طور پر صرف 200 ملین ہے۔ بلاشبہ قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کچھ تعلیم یافتہ لوگ عربی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن بہر حال ایک غالب تعداد ایسے لوگوں کی ہی ہے جو عربی سے نابلد ہیں اور محض اس کا رٹّا مار کر ثواب کمانے کی نیت سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا قرآن کا اعجاز صرف مٹھی بھر کے لوگوں کے لیے مخصوص تھا؟ کیا قرآن پڑھنے والوں کی غالب غیر عربی آبادی اس اعجاز کی منکر ہے؟

اگرچہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ درحقیقت قرآن کی اصل زبان کیا ہے لیکن چلیے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ نام نہاد کلاسیکل عربی ہے، لیکن دورِ حاضر کی عرب آبادی اپنی تمام تر ناخواندگی کے باوجود اسے نہ بولتی ہے، نہ پڑھتی ہے، نہ لکھتی ہے، حتیٰ کہ وہ کلاسیکل عربی میں اب سوچتی بھی نہیں ہے۔ دراصل آج اس کا سامنا دوشاگافی زبان (diglossia) سے ہے، یعنی ایسی صورت حال جب ایک ہی زبان کی دو اقسام موجود ہوں۔ یہ دو اقسام اعلیٰ اور ادنیٰ یعنی اشراف اور اجلاف میں منقسم ہیں۔ اول الذکر عربی کو اکثر جدید ادبی زبان کہا جاتا ہے یا جدید معیاری عربی کے نام سے یہ جانی جاتی ہے۔ یہ جدید معیاری عربی عموماً اسکول کی روایتی تعلیم سے اسی طرح وابستہ ہے جس طرح ہم سنسکرت یا لاطینی سیکھتے ہیں۔ اس زبان کا استعمال خطبوں، یونیورسٹی کے لیکچروں، خبروں کی نشریات اور دیگر ذرائع ابلاغ میں ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ادنیٰ عربی یا روزمرہ کی عربی مقامی آبادی کے لیے مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے جو گھروں میں بات چیت کے لیے، دوستوں سے گفتگو کے لیے، بازار میں خرید و فروخت کے لیے یا ٹی وی سیریل وغیرہ میں رائج ہے۔ کچھ مسلم اسکالر لسانی اعتبار سے عرب کی ایک بالکل گمراہ کن تصویر پیش کرتے ہیں، ان کے مطابق ایک مقامی اخبار پڑھنے والا شخص بھی قرآن یا کلاسیکل عربی کو بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اس بارے میں جلیل القدر عالم دین، مفسر قرآن اور ممتاز ریسرچ اسکالر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی درج ذیل رائے پڑھ لیں تو شاید مجھے اپنے مؤقف کی شہادت پیش کرنے کی مزید ضرورت پیش نہ آئے:

> عربی زبان بالخصوص قرآن کی زبان کے معاملے میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس وقت وہ زبان کہیں بھی رائج نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ عرب اور عجم دونوں ہی میں اس وقت جو عربی پڑھی پڑھائی اور لکھی بولی جاتی ہے، وہ اپنے اسلوب و انداز، اپنے لب و لہجہ اور اپنے الفاظ و محاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے، جس میں قرآن ہے۔ ہمارے اپنے عربی مدرسوں میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے، وہ قلیوبی، نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری و متنبی کے قسم کی عربی ہے۔ عرب، شام اور مصر میں جو عربی رائج و مقبول ہے، اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل و اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے، لیکن قرآن کی زبان سے یہ اتنی مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق نہیں پیدا کرتا بلکہ قرآن سے یہ بیگانہ کرتا ہے۔

اس واضح اور کھلے اعتراف کے بعد بھی اگر کوئی اس "بیگانگی" کو معجزہ یا اعجاز سے تعبیر کرتا

ہے تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ اس عقیدے کی اساس علمی اور لسانی نہیں بلکہ ایمانی ہے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک شخص کو حضرت عمر فاروق کے پاس لائے جو ان اللہ بریٓ من المشرکین و رسولُہ ''میں رسولُہ کے لام پر بجائے پیش کے زبر پڑھتا تھا جس کے معنی بالترتیب، ''بے شک اللہ اور رسول مشرکوں سے بری ہیں'' کی بجائے ''بے شک اللہ مشرکوں اور اپنے رسول سے بری ہیں'' کے نکلتے تھے۔ زیر اور پیش کے فرق سے معنی میں جو فرق پیدا ہو گیا، وہ ظاہر ہے۔ اس شخص سے جب اس فرق کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ مدینہ میں کسی شخص نے اسے ایسا ہی سکھایا ہے۔ اس واقعے کے بعد ابوالاسود دوئلی سے قواعد مرتب کرنے کے لیے کہا گیا جو اس زمانے میں عربی کا مشہور عالم ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ قرآنی متن کو جو لوگ معجزہ قرار دیتے ہیں، انھیں اپنا قبلہ درست کر لینا چاہیے کہ وہ اس زبان کا محتاج ہے جو انسانوں کی ایجاد کردہ ہے اور جو تمام دوسری زبانوں کی طرح نقائص سے پُر ہے۔ ایسی کسی زبان کے متن کو محل اعجاز قرار دینا حماقت ہو گی۔ اگر خدا کو اپنی قدرت کاملہ کا نمونہ ہی دکھانا مقصود تھا تو پھر وہ اپنی کتاب کے ساتھ ایسی زبان بھی نازل کرتا جس طرح یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ''کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام'' یعنی ہر بچے کے دل کو وہ مسلمان پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر بچے کی زبان کو بھی قرآن کی زبان بنا سکتا تھا تا کہ اس کی قدرت کو اور اس کی کتاب کے اعجاز کو ہر فرد، ہر بشر، ہر قریہ، ہر شہر اور ہر ملک میں یکساں طور پر سمجھا جا سکتا اور اس سے فیضیاب ہوا جا سکتا، تب شاید قرآن واقعی ایک معجزہ مستمرہ بن سکتا تھا۔

Jurat-e-Tehqiq

عربی زبان اور اس کا رسم الخط

گذشتہ باب میں کہا جا چکا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان مکمل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معجزہ ہے۔ زبان نام ہے مجموعۂ الفاظ کا۔ الفاظ مرکب ہیں اصوات سے اور اصوات نام ہے ان تصاویر، خطوط اور نشانات کا جو ارتقا کی منزلیں طے کر کے آج حروف کے نام سے ہمارے سامنے ہیں۔ یہی حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اپنی مربوط صورت میں رسم الخط کہلاتے ہیں۔

سر ولیم جونز نے کہا تھا کہ:

> مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آ سکتا ہے، نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکے۔ خیالات اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ اور اگر خیالات مشکل ہوں تو وہ بھی مشکل، اس طرح مکمل رسم الخط وہ ہے جس میں اس زبان کی ہر آواز کے لیے ایک مخصوص نشان ہو۔

قرآن جس کے بارے میں مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ پوری دنیا کے لیے مشعل ہدایت ہے اور اس کی مخاطب پوری عالم انسانیت ہے، اس لیے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ قرآن نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جس زبان (عربی) کو اپنا ذریعہ (میڈیم) بنایا، اول تو وہ عالمگیر نہیں ہے، دوم اس زبان میں کئی ہئیتی خامیاں ہیں، سوم اس کا رسم الخط کتابت کے نقطۂ نظر سے ناقص ہے اور چہارم یہ کہ اسی زمانے میں کچھ ایسی زبانیں بھی موجود تھیں جو عربی کے مقابلے میں زیادہ ہمہ گیر اور ان نقائص سے پاک تھیں۔ ان پر تفصیلی غور و فکر سے قبل ضروری ہے کہ عربی زبان اور اس کے رسم الخط کے ابتدائی پس منظر ایک نظر ڈال لی جائے۔

عربی زبان اور اس کے رسم الخط کا پس منظر

عربی زبان، سامی اقوام کی ایک شاخ ہے۔ ان قوموں میں سریانی، فینیقی، ارامی، حبشی، سبئی اور عربوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ مؤرخین نے عرب اقوام کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے، (۱)

عرب بائدہ، (۲) عرب عاربہ یا قحطانی عرب اور (۳) عرب مستعربہ یا عدنانی عرب۔ یہ تمام قومیں عربی زبان بولتی تھیں۔ عربی زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کے متعلق ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے کہ سامی اقوام اپنی بستیوں میں جو زبانیں بولتی تھیں، ان ہی کی ایک شاخ عربی زبان بھی ہے یعنی عربی زبان کا آریائی یا حامی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جس طرح عربی زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی تھی، اسی طرح اس کے رسم الخط کے بارے میں بھی علما اور ماہرین لسانیات کی معلومات محدود تھیں۔ تقریباً ایک صدی قبل مستشرقین نے مختلف عرب ممالک میں آرکیالوجی کی مدد سے جو تحریریں اور کتبے حاصل کیے ہیں، ان کی بنیاد پر علما کا خیال ہے کہ ہزاروں سال قبل بحر روم کے ساحلوں پر بسنے والے قوموں میں جب تہذیب و تمدن کا ارتقا ہوا تو انھوں نے اس وقت تک رائج تصویری زبان کو پہلی مرتبہ رسم الخط میں تبدیل کیا۔ بعد میں جب ان کے ہاں تہذیب و تمدن نے مزید ترقی کی، صنعت و حرفت بڑھی اور تجارت میں مزید توسیع ہوئی تو 3600 قبل مسیح بلکہ غالباً اس سے بھی بہت پہلے ایلام سومیریا اور مصر میں ایک رسم الخط ایجاد ہوا جس میں تصورات کو تصویروں کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا۔ اس رسم الخط کا نام ''ہیر وغلیفی'' تھا۔ اس رسم الخط کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پورے جملے کی ترجمانی ایک تصویر کرتی تھی۔ فینیقی قوم نے جو ان دنوں کنعان میں بحر روم کے ساحل پر آباد اور تجارت پیشہ تھی، مصر میں ایجاد شدہ حروف تہجی کو ٹائر (Tyre)، سڈون (Sidon)، ببلوس (Byblos) کے علاقوں کے علاوہ بحر روم کے ساحل پر آباد تمام شہروں میں پہنچایا اور انھی شہروں میں قدیم سامی قوم ارامی بھی رہتی تھی جس نے اس رسم الخط کو ان کے ذریعہ سیکھا۔ فینیقوں کے رواج دیے گئے اس رسم الخط سے بعد میں دو مزید رسم الخط نکلے جن میں ایک جنوبی عربی یعنی یمن میں جس کا نام ''خط مسند'' تھا اور یہ خط قبل مسیح پورے جزیرۂ عرب میں استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا خط ''ارامی یا نبطی خط'' تھا، اس کا رواج شمالی عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ذریعے ہوا جو اس وقت بنی ارم کی زبان میں لکھتے تھے۔ بعد ازاں خط مسند کی کئی اور شاخیں وجود میں آ گئیں۔ چنانچہ جزیرۂ نما عرب کے شمالی حصہ میں رسم الخط صفوی، ثمودی اور لحیانی کا رواج رہا اور جنوبی حصہ میں حیری کا۔ عربوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنا حجازی رسم الخط حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لیا اور انھوں نے نبطیوں اور کندیوں سے، اور ان لوگوں نے خط مسند سے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ قبیلہ طے کے تین افراد نے عربی رسم الخط ایجاد کیا تھا جن کے نام مرار بن مرۃ، اسلم بن

سدرۃ اور عامر بن جدرۃ ہیں۔ انھوں نے سریانی زبان کے قاعدوں کے مطابق عربی زبان کے رسم الخط کو ڈھالا اور انبار کے بعض لوگوں نے اس کو تعلیم دی، انباریوں نے اس خط کو حیرہ کے لوگوں کو سکھایا اور بشر بن عبدالملک نے جو دوت الجندل کے والی اکیدر بن عبدالملک بن عبدالجن الکندی کا بھائی اور مذہباً عیسائی تھا، حیرہ میں اپنے قیام کے زمانے میں اس رسم الخط کو سیکھا اور مکہ میں جب ایک مرتبہ ٹھہرا تو اس نے سفیان بن امیہ اور ابو قیس بن عبد مناف کو لکھنے کا طریقہ بتایا اور اس طرح مکہ میں لکھنے کا رواج ہوا۔ قصہ مختصر یہ کہ عربی کتابت کی ابتدا ظہورِ اسلام سے کچھ عرصہ پہلے ہوئی تھی۔

عربی رسم الخط کی خامیاں

پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ کوئی بھی زبان نہ تو مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی عالمگیر۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص ماحول اور تہذیب کی زائیدہ ہوتی ہے۔ عربی زبان میں بعض ایسے بنیادی عیوب ہیں جو ان تمام زبانوں میں مشترک ہیں جن پر لفظ سامی کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان عیوب میں ایسی آوازیں ہیں جن کا عجم کی زبان پر جاری ہونا دشوار ہے اور بہت سی ایسی پیاری آوازیں ہیں جو عجم کی زبان میں مروج ہیں لیکن عرب میں ندارد۔ یہ عیوب معمولی نہیں ہیں بلکہ ان کے رہتے صرف عربی زبان ہی نہیں بلکہ کوئی بھی سامی زبان عالمگیر زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ کسی آفاقی پیغام کی ترسیل کے لیے کسی بھی زبان کی ایسی عاجزی اسے اعجاز سے محروم رکھنے کے لیے کافی ہے۔ سامی زبانوں کے انھی عیوب کے سبب ان کا رسم الخط اس درجہ ناقص ہے کہ ان کا لکھنا، گویا ان پر ظلم کرنے کے مترادف تھا۔ یہ زبانیں کتابت کے لیے بھی موزوں نہیں تھیں۔ میں یہاں کچھ بنیادی عیوب نشان زد کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

(1) عربی میں کئی آوازوں کے لیے حروف موجود ہی نہیں ہیں، مثلاً مفرد حروف میں؛ پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ژ، گ اور مرکب حروف میں: گھ، دھ، ٹھ، بھ، ڈھ، جھ، کھ وغیرہ جیسی اہم آوازیں جو بیشتر عجمی زبان میں ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہیں، وہ عربی حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں۔ عربی کی بہ نسبت فارسی اور بطور خاص اردو میں زیادہ اصوات موجود ہیں۔

(2) عربی کے حروف کئی شکلیں بدلتے ہیں۔ کبھی پورے لکھے جاتے ہیں، کبھی آدھے اور کبھی کبھی صرف ان کا چہرہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی عربی لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں حارج ہوتی ہے اور

عربی پر قابو پانے کے لیے دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ وقت ضائع ہوتا ہے۔

(3) عربی میں ہم صوت یعنی ایک ہی قسم کی آواز رکھنے والے حروف متعدد ہیں؛ مثلاً ا،ع۔ ت اور ط، ث،س،ص۔ ذ،ز،ظ۔ ح،ھ،ہ وغیرہ۔ یہ آوازیں لکھنا سکھانے میں خاص طور پر الجھن پیدا کرتی ہیں۔ طلبا کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوتا کہ وہ کون سا لفظ 'ث' سے لکھیں، کون سا 'س' سے لکھیں اور کون سا 'ص' سے۔ چنانچہ املا کی غلطیاں ایک عرصہ تک ان سے سرزد ہوتی رہتی ہیں اور وہ اس پر بمشکل قابو حاصل کر پاتے ہیں۔

(4) عربی میں اعراب کی دشواریاں ہیں۔ دیوناگری اور رومن کی طرح یہاں زیر، زبر، پیش کی طرح حروف نہیں ہیں، صرف قیاس سے زیر، زبر، پیش لگا کر کام چلایا جاتا ہے۔ یہ چیز تلفظ اور املا کے تعین میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

(5) عربی رسم الخط یک سر غیر صوتیاتی ہے، محض انداز سے پڑھتے ہیں کیوں کہ یہاں حروف علت کا کوئی نظام نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔

اگر خدا کو لسانی معجزہ دکھانا ہی تھا تو بجائے عبرانی یا عربی کے، وہ سنسکرت جیسی کسی آریائی زبان کو منتخب کرتا جو پڑھنے اور لکھنے کے اعتبار سے دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ کامل اور عیوب سے پاک ہے۔ آریائی زبانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اعراب حروف کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے، جب کہ سامی زبانوں میں اعراب چند اختراعی علامات کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اول الذکر زبان میں اعراب لفظ کا جز ہے اور کتابت میں التزاماً لکھا جاتا ہے، جب کہ ثانی الذکر زبان میں اعراب ایک خارجی علامت ہے جس کا لکھنا یا نہ لکھنا کاتب کی مرضی پر موقوف ہے۔

میرے خیال میں یہ بات اب تک واضح ہو جانی چاہیے کہ آریائی زبان میں ہر لفظ ایک ہی طرح پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے تلفظ کا کوئی متبادل نہیں ہوتا جب کہ اس کے برعکس سامی لفظ کا تلفظ تین چار بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد میں متوقع ہوا کرتا ہے، مثلاً عربی میں لفظ ''کتب'' پر اعراب نہ دیں تو اس کو ''کَتَبَ یا کُتِبَ یا کُتُبُ'' کچھ بھی پڑھ سکتے ہیں اور ان تینوں صورتوں میں سے کسی خاص صورت کو قرار دینا سیاق عبارت پر موقوف ہوگا۔ اس کے علی الرغم، اگر ان الفاظ کو سنسکرت یا یونانی یا رومی حروف میں لکھا جائے تو مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہے گی اور ان تینوں میں سے جو تلفظ مقصود ہوگا، وہ صاف وصریح طور پر اور بغیر کسی غلطی کے پڑھا جا سکے گا۔ اسی لیے صرف ونحو

اور لغت سے واقف ہوئے بغیر عربی کی عبارت کا صحیح طور پر پڑھنا تقریباً ناممکن ہے، جب کہ سنسکرت، یونانی یا لاطینی کی عبارت کو ایک بچہ بھی حروف شناسی کے بعد بلا تکلف اور بغیر معنی سمجھے ہوئے کم از کم پڑھ ضرور سکتا ہے۔

انھی خامیوں کے پیش نظر قرآن کی کتابت کی صحت کے لیے مصنوعی بند شیں بھی کی گئی ہیں جن کے سبب ان مسلمانوں کی آنکھوں سے یہ عیوب او جھل ہوگئے جو زمانۂ حال کے مطبوعہ قرآن پڑھنے کے عادی ہیں۔ اگر ہم ان عیوب کو اسلاف کی نظروں سے دیکھیں تو علم ہو گا کہ اس رسم الخط کی خرابی نے ہزاروں اختلافات قرأت پیدا کر دیے جو کبھی نہیں مٹیں گے۔

ابن عبد البر اپنی کتاب ''التمھید'' میں کہتے ہیں کہ قرآن لغت قریش میں نازل ہوا۔ اس کے معنی ان کے مطابق یہ ہوئے کہ اغلب حصہ لغت قریش پر مشتمل ہے، کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ لغت قریش کے علاوہ تمام قرأت میں دوسری زبانوں کے لغات بھی موجود ہیں مثلاً ھمزہ کا ظاہر کرنا اور ثابت کرنا، جب کہ قریش ھمزہ کا تلفظ نہیں کرتے۔ پھر جمال الدین بن مالک کے مطابق اللہ نے قرآن کو بجز اس کے تھوڑے حصے کے باقی سب حجازیوں کی لغت میں نازل کیا ہے مثلاً ''من یشاق اللہ'' اور ''من یرتدد منکم عن دینہ'' میں جواد غام ہے (یعنی ساکن حرف کے بعد متحرک حرف کو بلا فصل ایک مخرج سے ادا کرنا)، وہ بنو تمیم کی لغت کی رو سے ہے، کیوں کہ مجزوم کا ادغام انھی کی لغت ہے اور اسی لیے قرآن میں ایسا زیادہ ہے، مثلاً ''ولیملل یحببکم اللہ''، ''یمدد کم و اشدد بہ ازری'' اور ''ومن یحلل علیہ غضبی'' وغیرہ۔ رافعی نے اپنی ''اعجاز القرآن'' میں ابو بکر واسطی سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن میں چالیس لغات ہیں۔ اب ان لغات کی تحقیق کی کوئی سبیل نہیں، کیوں کہ یہ سارے لغات مٹ مٹا کر لغت قریش میں گھل مل گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علما اس کثیر تعداد میں سے ایک یا دو یا بس چند کلمات تک ذکر کر کے رہ جاتے ہیں۔ کہاں پوری زبان اور کہاں ایک دو کلمے۔ یہ لغوی سیاست تھی تا کہ اس کے ذریعہ عرب ایک زبان کی بنیاد پر ترقی کر کے جماعت واحدہ بن جائیں۔ قرآن کی عبارت سات مختلف لہجوں میں پڑھی جاتی رہی ہے، مثلاً ھمزہ کی تخفیف و تحقیق (تحقیق کے معنی یہ ہے کہ ہر حرف کو اس کا حق دیا جائے)، مدو قصر، فتح و امالہ (فتح یعنی تلفظ کرنے کے لیے قاری کا اپنے منھ کو پوری طرح کھولنا، اسے تفخیم بھی کہتے ہیں۔ اور امالہ یعنی فتح کو کسرہ کی طرف اور الف کو یا (ی) کی طرف اچھی طرح مائل کر کے ادا کرنا) اور ان کی درمیانی کیفیت، اظہار و ادغام، علیھما اور الیھم میں ھا کا ضمہ اور کسرہ اور ان دونوں میں واؤ کا الحاق (یعنی

عليهموااور اليهموا)اور منهم اور عنهم میں واؤ کا الحاق اور اليه وعليه میں یا کا الحاق (یعنی اليهي اور عليهي اور فيهي) وغیرہ۔ لہٰذا ہر طرز ادا والے اسے اپنے لب و لہجے میں پڑھتے تھے۔ نیز قرآن میں بھی اس کی نظیر ملتی ہے کہ ایک ہی کلمہ جسے مختلف اہل لغت کے نظم کلام کی رعایت سے دو وجہوں پر استعمال کیا گیا ہے جیسے براءاور برئی کہ اہل حجاز انا منك براءہی بولتے ہیں اور تمیم و دیگر عرب انا منك برئی بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں دونوں لغت ہیں، اسی طرح قرآن میں فاسربأهلك اور والیل اذایسر کے فقرے ہیں کہ اول الذکر میں لغت قریش کی رعایت ہے، چنانچہ وہ ''اسریت'' کہتے ہیں جب کہ دوسرے عرب ''سریت'' کہتے ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ جب ہم "فصیح عربی زبان" کی تدوین وتالیف کے موضوع پر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ علمائے لغت نے اپنی کتابوں اور لغات میں صرف قریش کی زبان کو ہی مدون نہیں کیا بلکہ بہت سے ایسے الفاظ ان کے اندر جمع کر دیے ہیں جو عرب کے دوسرے قبیلوں میں بولے جاتے تھے اور جن سے قریش بالکل ناواقف تھے۔ان تمام الفاظ کو "فصیح عربی زبان" کے سر منڈھ دیا گیا اور لوگوں نے یہ فراموش کر ڈالا کہ یہ فصیح عربی زبان قبائل عرب میں سے ایک خاص قبیلے یا ممالک عربیہ کے مختلف خطوں میں سے ایک خاص خطے حجاز کی زبان ہے۔

''انزل القرآن علیٰ سبعة احرف''والی روایت سے عام مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے سات طریقہ پر قرآن کی قرأت کی اجازت دی ہے،جب کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے طیبی شرح مشکوۃ وغیرہ جیسی کتب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ارباب تحقیق کا فیصلہ یہ ہے کہ سبعہ (سات کے عدد سے واقعی سات کا عدد مراد نہیں ہے بلکہ اردو میں جیسے ''بیسیوں'' کے لفظ سے بیس کا عدد نہیں بلکہ صرف کثرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، یہی حال عربی زبان میں سات کا ہے اور احرف (حروف) سے تلفظ اور لب ولہجہ کا وہ اختلاف مقصود ہے جو عرب کے مختلف قبائل میں عادتاً تھا۔ پھر جب اسلام عرب سے باہر نکل کر عجم میں داخل ہوا تو ظاہر ہے کہ تلفظ اور لب ولہجہ میں صرف قریش کے طرز کی پابندی انتہائی دشوار تھی،اس لیے خلیفۂ سوم عثمان نے نوشت وکتابت کی حد تک قرآن کو قریش کے تلفظ کے مطابق لکھوا کر محفوظ کر دیا، رہا قرآن کی قرأت کا معاملہ تو یہ عثمان کے بس کی بات ہی نہیں تھی کہ وہ عرب کے تمام قبائل اور عجم کے سارے باشندوں کو اس تلفظ اور لب ولہجہ کا پابند کر دیتے جو پیغمبر اسلام کا تھا، کیوں کہ تلفظ اور لب و لہجہ کا اختلاف عادتاً، فطری اور

پیدائشی ہوتا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:

عجمی مسلمانوں کو تو ابھی جانے دیجیے، خود عربی قبائل میں تلفظ اور لہجوں کا اختلاف کیا معمولی تھے؟ قرآنی آیت "قد جعل ربك تحتك سريا" کو قبیلہ قیس والے جو 'ك' تانیث کا تلفظ 'ش' سے کرتے تھے، ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر یہی آیت قیس کے قبیلہ والوں کے قرآن میں بایں شکل لکھی ہوئی ملتی ہے، یعنی "قد جعل ربش تحتش سريا"۔ قیس کے اس طرز تلفظ کا اصطلاحی نام "كشكشه قيس" تھا۔ اسی طرح تمیم والے 'اَنُ' کے لفظ کو 'عَنُ' کی شکل میں ادا کرتے تھے، اس کا نام 'عنعنه تميم' تھا، مثلاً "عسى الله ان ياتى بالفتح" کی شکل میں وہ ادا کرتے۔ سب سے دلچسپ اس قبیلہ کا تلفظ تھا جو 'س' کے حرف کو 'ت' کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا، اسی وجہ سے پوری سورۃ الناس کی ہر آیت کے آخری لفظ میں بجائے 'س' کے ان کے قرآن میں ہم گویا 'ت' کو پاتے ہیں، مثلاً "قل اعوذ برب النات" الخ۔ اس معاملے میں لوگ اس درجہ مجبور تھے کہ ابن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی جو اصلاً و نسلاً ذہلی قبیلہ سے تھے، ان تک کو حضرت عمر نے اس لیے ٹوکا کہ وہ "حتیٰ حین" کا تلفظ "عتی عين" کی شکل میں کر رہے تھے۔ جب خالص عربی قبائل کا یہ حال تھا تو بیچارے عجمیوں میں پہنچ کر قرآنی نسخوں کی املا اور قرأت کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے۔ دور کیوں جایئے، ہندوستان ہی کا نتیجہ کیا ہوتا، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں جتنے قرآن پنجاب میں طبع ہوتے، ان میں ہر جگہ بجائے 'ق' کے 'ك' ہی چھاپا جاتا، اسی طرح دکن میں جو قرآن چھپتے 'ق' کی جگہ 'خ' اور 'خ' کی جگہ 'ق' لوگوں کو ہر جگہ نظر آتا۔ (تدوین قرآن)

یہ قصہ کافی طویل ہے، لیکن چونکہ ہمارا موضوع محض عربی زبان اور اس کے رسم الخط کے نقائص پر مشتمل نہیں ہے، چنانچہ میں یہاں مزید دو چار مثالیں دے کر اس ذیلی مقدمے کو سمیٹنا چاہتا ہوں۔

"الحمد الله رب العٰلمين" میں 'اَلحَمدُ'، 'اَلحَمدِ' اور 'اَلحَمدَ' تینوں صورت میں پڑھا گیا اور ان میں سے تینوں قرأت کا جواز بھی موجود ہے۔ "مٰلك يوم الدّين" قرآن کے اسلوب خط میں 'مَلك' اور 'مٰلك' ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے یعنی 'مٰلك' میں میم کے بعد الف نہیں ہوگا، بلکہ میم پر الف مقصورہ کی علامت دی جائے گی، لیکن بعض قاری نے اسے "مَلك يوم الدين" یعنی

روز حساب کا شہنشاہ بھی پڑھا ہے۔ جن علمانے 'مُلك' قرأت کی، ان کا کہنا یہ ہے کہ **'ملك'** یعنی بادشاہ اگر کسی ظالم کو خلعت وانعام سے نوازے یا کسی معصوم شخص کو سزا دے تو اسے ظالم اور غیر منصف کہا جائے گا۔ اللہ چونکہ حکیم و عادل ہے، ساری کائنات اس کی ملکیت ہے، اپنی مِلك میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔ اس لیے اس کی صفت ''مُلك یوم الدین'' ہی ہو سکتی ہے۔ تشریح و تعبیر کی یہ اٹھاپٹک دراصل زبان کی ترسیل کے المیہ کو نشان زد کرتا ہے۔ مشہور مستشرق بلاشیر ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' کے ترجمے میں کہتا ہے کہ یہ استفہامیہ مع الانکار ہے یعنی کیا ایسا نہیں کہ اللہ کے ذکر سے اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا؟ اور معنی محذوف یہ کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ اسی طرح A.J. Arberyنے اپنی کتاب "Qur'an Interpreted"میں درج ذیل آیت مقتبس کرنے کے بعد اس کا ترجمہ پیش کرتا ہے:

وَهُوَ الَّذِی جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن یَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا(سورہ الفرقان:62)

Who has created Day and Night in succession for whom He desires to Remember or He desires to be thankful.

ظاہر ہے کہ یہاں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ اللہ کس کا شکر گذار ہونا چاہے گا؟

عربی زبان کی خوبیاں گنوانے والے اس کی وسعت کو ذخیرہ الفاظ (Vocabulary) سے جوڑتے ہیں۔ وہ اس بات پر اتراتے ہیں کہ عربی میں چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کے بڑے تفصیل سے علیحدہ نام ہوتے ہیں جس کا کسی دوسری زبان میں تصور بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم اس دعوے کو عملی سطح پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو عجیب و غریب صورت حال سامنے آتی ہے۔ مثلاً عربی میں ''تلوار'' کے لیے ایک ہزار الفاظ، ''اونٹ'' کے لیے دو سو پچیس الفاظ، ''سانپ'' کے لیے ایک سو اور ''پانی'' کے لیے ایک سو ستر الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ خود قرآن میں اللہ نے ''گروہ'' کے لیے بیس سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ زبان کا حسن نہیں بلکہ بے جا اصراف ہے۔ یہاں عربی زبان کو پڑھنے لکھنے والوں کے لیے آزمائشی مرحلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا ایک ایک لفظ کے سینکڑوں مترادفات ذہن نشین رکھے ورنہ ترسیل کا المیہ پیدا ہونے کا خدشہ لاحق رہے گا۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ عربی زبان میں دو سو سے زائد ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی تین تین ہیں، سو سے زائد

الفاظ کے چار چار معنی ہیں اور بعض کے پچیس پچیس؛ مثلاً ''خال'' کے ستائیس، ''عین'' کے پینتیس اور ''عجوز'' کے ساٹھ معنی ہیں۔ ایسے الفاظ کو بڑی فخر کے ساتھ کثیر المعانی الفاظ کے زمرے میں رکھ کر عربی زبان کے گن گائے جاتے ہیں لیکن یہاں بھی اس کی عملی صورت انتشار کا سبب ہے، جس کی ایک جھلک آپ قرآن کے مفسرین اور شارحین کی مختلف تعبیروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ نتیجہ معلوم کہ کسی آیت سے اپنے عقیدے اور تحفظات کے دفاع میں بآسانی معنی نکالے جاتے رہے ہیں جو قرآنی متن کو منشائے مصنف سے کافی دور لے جانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہ ساری مثالیں اس ترسیل کے المیہ کی جانب ہماری توجہ مبذول کرتی ہیں کہ بقول مسلمانوں کے ''اہل جنت کی زبان عربی'' میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ عالمگیر تو کجا، جس ماحول اور تہذیب کی وہ زائیدہ تھی، انھی کی تمدنی ضرورتوں کا بار اٹھا پاتی۔ لیکن حیرت ہے کہ یہی زبان اپنے تمام نقائص اور عجز بیانی کے ساتھ لوح محفوظ میں مرقوم ہے جس میں انسانی اصلاحات اور تصرفات کی کثرت ہے۔

کلام اللہ کی حقیقت

گذشتہ دو ابواب میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اللہ نے نہ تو اپنے آفاقی پیغام کو ہم تک پہنچانے کے لیے کوئی نئی عالمگیر زبان خلق کی جو واقعی ایک بڑا معجزہ کہلاتا، اور نہ ہی اس نے انسانی زبان کے عیوب کی اصلاح کی جو معجزہ کے مشابہ ہوتا۔

زیر نظر باب میں سب سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ''کلام اللہ'' سے کیا مراد ہے۔اس سلسلے میں مسلمان اتفاق رائے نہیں رکھتے۔

کلام اللہ سے مراد

غالب اکثریت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کا کلام الفاظ اور حروف کی ترتیب سے مل کر بنا ہے، اور معنی کی دلالت انھیں الفاظ پر منحصر ہے۔ گویا ان کے نزدیک اللہ کا کلام صرف معنی ہی نہیں بلکہ الفاظ و عبارت بھی اللہ کی ذات سے منسوب ہے۔اس قاعدے کی رو سے الہامی زبان کو سلیس و لطیف ہونا چاہیے اور اس کا عام کلام کی قوت اور اثر سے متجاوز ہونا بھی ضروری ہے، کیوں کہ اللہ کے ہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی جس میں نقص ہو۔ مختصر یہ کہ ہمیں کلام اللہ سے کم از کم افلاطون کی سی لطافت اور سسرو کی سی بلاغت کی توقع ہونی چاہیے۔ خیر ہمارے علما جوش عقیدت میں یہ بھی کر گذرے اور انھوں نے قرآن میں ایسی ایسی بلاغت و فصاحت ڈھونڈ نکالی جس کا عشر عشیر بھی افلاطون اور سسرو کو نصیب نہیں ہوا۔ اگر ہم نے پہلے ہی سے یہ تصور کر رکھا ہے کہ حروف و اصوات کا مرکب کلام اللہ ہے تو پھر ہمیں اس بات پر ایمان رکھنے سے بھلا کون روک سکتا ہے کہ وہ ہو بہو لوح محفوظ میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مختصر اور آسان لفظوں میں اس گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح دیوان حافظ، لسان الغیب حافظ شیرازی کا کلام ہے، اسی طرح قرآن اللہ کا کلام ہے۔

چنانچہ اگر قرآن کو معنی کے ساتھ ساتھ الفاظ اور عبارت کی صورت میں بھی اللہ کا کلام مان لیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی فصاحت و بلاغت قوت بشری سے خارج ہو گی بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ دعویٰ کرنا بھی جائز ٹھہرتا ہے کہ چونکہ خدا قدیم ہے، اس لیے اس کا کلام بھی قدیم ہو گا۔

یہ ایک غلط فہمی مسلمانوں کو عرصہ تک ناکوں چنے چبواتی رہی۔انھوں نے نہ تو فصاحت وبلاغت کے اصول پر کبھی غور کیا اور نہ کلام اللہ کے قدیم ہونے پر کوئی تحقیق ہی کی۔ لیکن جب کچھ لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تو انھوں نے اس بنیادی حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ وہ کلام جو انسانی حروف واصوات سے مرکب ہو اور جو مخصوص تمدن کی زائیدہ ہو، وہ کلام قدیم نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کہ جو کلام ہمیں ایک انسان کی زبان سے ملا، وہ طاقت بشری سے خارج ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ دوسرا گروہ جو ایک مخصوص طبقہ کے علما پر مشتمل ہے،اس کے مطابق زبان خدا کی نہیں بلکہ انسان کی ہے۔ قرآن کی بھی عربی انسان کی عربی ہے۔ زبان سے یہاں مراد وہ چیز ہے جو ہماری زبان اور ہونٹوں اور تالو کے باہم رگڑنے سے وجود میں آتی ہے اور پھر ہوا کے توسط سے ہمارے کان کی جھلی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس تصور کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایسا ایمان رکھنا کہ خدا عربی بولتا ہے، عبرانی بولتا ہے، سنسکرت بولتا ہے وغیرہ یا وہ شعرائے عرب کے ساتھ مشاعرہ پڑھتا تھا، ان سے تحدی کرتا تھا، بالکل کفر معلوم ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے ”تفہیمات الٰہیہ“ میں اس بکھیڑے سے جان چھڑانے کے لیے فرمایا کہ ”الفاظ قرآن تو لغت عربی ہیں جن کو محمد جانتے تھے اور جن کو خیال میں لاتے تھے لیکن معنی اس کے آپ کو غیب سے حاصل ہوتے تھے۔“

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهِۦ (سورہ ابراہیم:4)”اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا۔“یعنی اللہ کا کلام، اللہ کی زبان میں نہیں بلکہ اس قوم کی زبان میں ہوا کرتا تھا جس کے لیے وہ مخصوص تھا۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ کلام اللہ کی زبان انسانی ہے جس میں سینکڑوں نقائص ہیں، پھر ایسی زبان میں اترا ہوا کلام بھلا کیوں کر کامل کہا جا سکتا ہے اور اسے کس طرح طاقت بشری سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے؟

ایک دوسری آیت بھی دیکھ لیتے ہیں؛نَزَلَ بِهِ ٱلرُّوحُ ٱلۡأَمِينُ عَلَىٰ قَلۡبِكَ لِتَكُونَ مِنَ ٱلۡمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ(سورہ الشعرا: 193-195) ”اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، تیرے دل پر تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو، صاف عربی زبان میں۔“

کچھ مفسرین کے مطابق صاف یا سلیس عربی والا جملہ اَلۡمُنذِرِينَ سے متعلق ہے اور مُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ میں مُّبِينٍ ہود، صالح، شعیب اور اسمعیل تھے۔ لیکن اس میں سب سے اہم بات جو ہے، وہ یہ کہ اللہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ جبرئیل نے اسے تیرے دل پر اتارا۔ اب ظاہر ہے کہ

القامضامین ہوا کرتے ہیں، نہ کہ ترتیب و نظم الفاظ میں۔اس القا کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد اس مضمون کو سلیس عربی میں باندھنے لگے، یعنی الفاظ پیغمبر کی زبان سے ادا ہوئے۔دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ سلیس عربی نثر اگرچہ اہل عرب کو مرغوب نہ ہو لیکن اس کے بولنے والے محمد سے پہلے ظاہر ہو چکے تھے جن کو منذرین کہا گیا، یعنی اس سلیس عربی زبان کو بولنے میں بھی محمد کو کوئی اختصاص حاصل نہ ہو پایا بلکہ منذرین کے شریک قرار دے دیے گئے۔

"اتقان" میں نزول قرآن کے مسئلے پر تین اقوال پیش کیے گئے ہیں:

(1) لفظ و معنی بجنسہ وہی ہیں جو لوح محفوظ پر کندہ ہیں، جن کو حفظ کر کے جبرئیل نازل کیا کرتے تھے۔

(2) جبرئیل صرف معنی لے کر حاضر ہوتے تھے اور ان معانی کو نبی عربی الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا کرتے تھے۔

(3) جبرئیل پہلے تو محمد پر معنی القا کیا کرتے تھے، پھر خود ہی ان معانی کو عربی الفاظ کے قالب میں ڈھال کر انھیں پیش کر دیا کرتے تھے۔ یہ عمل کافی پیچیدہ تھا اور جبرئیل کی پریشانی میں اضافہ کر دینے والا تھا۔

اس ضمن میں سر سید احمد کا موقف تھا کہ؛

> میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف مضمون القا کیا گیا اور الفاظ آنحضرت کے ہیں؛ جن سے آنحضرت نے اپنی زبان میں جو عربی تھی، اس مضمون کو بیان کیا۔

سر سید نے اپنے اعتراض کو سند دینے کی خاطر قرآن کی دو آیتوں سے استدلال کیا؛ پہلی آیت "نزله به الروح الامین علہ قبلکه" اور دوسری آیت سورۂ یوسف کی "انا انزلنا قرانًا عربیاً لعلکم تعلقون" (یعنی ہم نے قرآن عربی میں نازل کیا، شاید کہ تم سمجھ لو۔) سر سید احمد نے اپنے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے عقلی دلیل یوں پیش کی ہے؛

> کوئی مضمون دل میں مجرد عن الالفاظ آ ہی نہیں سکتا ہے اور نہ القا ہو سکتا ہے۔ تخیل اور تصور کسی مضمون کا مستلزم ان الفاظ کے تخیل یا تصور کا ہے جن کا وہ مضمون مدلول ہے۔

سر سید اپنی دلیل پیش کرنے کے بعد کھل کر اس نتیجے تک پہنچتے ہیں؛

> اس بیان میں صریح نقص یہ ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو جو الفاظ قرآن مجید

کے ہیں، وہ خدا کے الفاظ نہیں رہتے بلکہ اس کے ہو جاتے ہیں جس میں وہ پیدا کیے گئے، خواہ وہ جبرائیل ہوں یا نبی۔ اور چونکہ وہ کلام انھی الفاظ سے مرکب ہوا ہے تو وہ کلام بھی اسی شخص کا ہوا نہ کہ خدا کا۔

سرسید احمد تقلید کی گرفت سے نکلنے کے باوجود مقلدانہ افکار کے ایسے اسیر رہے کہ ان کی تمام شرح و تفسیر تضاد کا ملغوبہ بن کر رہ گئی۔ سورہ اعراف کی تفسیر لکھتے ہوئے آپ ایک جگہ فرماتے ہیں، ”میرے نزدیک معانی اور الفاظ دونوں قائم بالنفس ہیں اور دونوں قدیم اور غیر متغیر ہیں۔“

سورہ بقرہ کی تفسیر میں آپ فرماتے ہیں؛

اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر واقع ہے اور چونکہ وہ ایسی وحی ہے جو پیغمبر کے قلب نبوت پر نہ بطور مضمون و معنی کے بلکہ بلفظ ڈالی گئی تھی جس کے سبب ہم اس کو وحی متلو یا قرآن یا کلام خدا کہتے اور یقین کرتے ہیں۔ اس لیے ضرور تھا کہ وہ ایسے اعلیٰ درجہ فصاحت پر ہو جو بے مثل و بے نظیر ہو۔

لیکن اگر یہی سب کچھ کہنا تھا تو پھر سرسید نے اپنی تفسیر میں وحی اور نبوت کے متعلق خواہ مخواہ تاویلات سے کام لیا، ملاحظہ فرمائیں؛

وحی وہ چیز ہے جس کو قلب نبوت پر بہ سبب اسی فطرت نبوت کے مبدائے فیض نے نقش کیا ہے، وہی انتعاش قلبی، کبھی مثل بولنے والی آواز کے انھیں ظاہری کانوں سے سنائی دیتا ہے اور کبھی وہی نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے مگر بجز اپنے آپ کے نہ کوئی وہاں آواز ہے اور نہ بولنے والا۔

پھر سرسید احمد بلا تکلف کہتے ہیں؛

نبی خود اپنا کلام نفسی ان ظاہری کانوں سے اسی طرح سنتا ہے جیسے کوئی دوسرا شخص اس سے کہہ رہا ہو۔ وہ خود اپنے آپ کو ان ظاہری آنکھوں سے اسی طرح دیکھتا ہے جیسے دوسرا شخص اس کے سامنے کھڑا ہوا ہو۔

سرسید اپنے اس تصور میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ جبرئیل کو بھی وجود فی الخارج تسلیم نہیں کیا۔ آپ فرماتے ہیں؛

یہ سب کام اسی فطری قوت نبوت کے ہیں جو خدائے تعالیٰ نے مثل دیگر قوائے انسانی

کے، انبیا میں مقتضائے فطرت پیدا کی ہے اور وہی قوت ناموس اکبر ہے اور وہی قوت جبرئیل پیغامبر۔

اگر یہی درست ہے تو پھر فیصلہ ہو گیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہو ہی نہیں سکتا بلکہ یہ حقیقتاً کلام رسول ہے اور مجازاً کلام اللہ ہے، کیوں کہ بولنے والا بجز پیغمبر کے کوئی دوسرا وجود خارجی نہ تھا۔ جبرئیل تو محض ایک نام ہے ملکہ نبوت کا۔ لہٰذا میں یہ سمجھنے قاصر ہوں کہ قرآن کو ایسی وحی کہنے سے سرسید کی کیا مراد ہو سکتی ہے، "جو پیغمبر کے قلب نبوت پر نہ بطور مضمون و معنی کے بلکہ بلفظ ڈالی گئی تھی"۔ اب تو اس کلام کے لیے بالکل ضروری نہیں کہ "وہ ایسے اعلیٰ درجہ فصاحت پر ہو جو بے مثل و بے نظیر ہو۔" اب وہ فصیح ہو یا غیر فصیح، کیا فرق پڑتا ہے؟ اس موڑ پر آکر قرآن کی فصاحت محض ایک علمی مسئلہ بن کر رہ جاتی ہے جس پر غور و فکر کرنا علم الٰہی کا منصب نہیں بلکہ علم ادب کا رہ جاتا ہے۔

یہودیوں کی تقلید

اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ ثابت ہو گا قرآن کا بلفظ کلام خدا کا تصور جو مسلمانوں میں عام ہے، وہ محض اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کے عقیدے کی تقلید سے پیدا ہوا جو وہ توریت کی نسبت رکھتے ہیں اور جس پر قرآن نے جلی حرفوں میں صاد لکھ دیا۔ دراصل جب یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان مناظرہ و مخالفت کا بازار گرم ہوا تو مسلمانوں نے سوچا کہ اگر ہم بھی اپنے قرآن کو اسی معنی میں اللہ کا کلام مانیں، جس معنی میں ہم توریت کو مان چکے ہیں تو یہودیوں کے سامنے ہماری بڑی توہین ہو گی اور ہم پر الزام عائد کریں گے کہ تمھارا قرآن خود بقول تمھارے توریت کے مقابلے میں گھٹیا ہے۔ توریت کے متعلق جو ہم مانتے ہیں، تم اس کی تصدیق کرتے ہو۔ لیکن قرآن کے بارے میں تم ایسا دعویٰ نہیں کر سکتے، اس لیے ہم پر تمھاری حجت ناتمام رہی۔ اس اعتراض سے بچنے کے لیے مسلمانوں نے بھی قرآن کو لفظی معنی میں اللہ کا کلام تسلیم کر لیا۔ پھر اسے قدیم بھی کہا اور لاثانی فصیح و بلیغ تک کہہ ڈالا۔

توریت کی شان یہ رہی کہ خود قرآن نے اسے بلفظ کلام الٰہی تسلیم کر لیا جیسا کہ یہودی کرتے ہیں۔ قرآن کے سورہ اعراف کی آیت 145 کا یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیں؛ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ، یعنی اللہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے موسیٰ کی تختیوں پر ہر شے لکھ دی۔ اور پھر اسی سورہ کی آیت 154

میں کہتا ہے؛ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ یعنی اور اس کے لکھے ہوئے میں ہدایت تھی اور رحمت۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ حضرت آدم نے موسیٰ کو مخاطب کر کے کہا؛

تو وہ موسیٰ ہے جس کو خدا نے بات کرنے کے لیے چن لیا اور تیرے واسطے اس نے لکھ دی توریت اپنے دست خاص سے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب السنتہ، مسلم کتاب القدر، بخاری آدم وموسیٰ)

اسی ضمن میں مسلم کی دوسری روایت ہے؛

کچھ تجھے معلوم ہے کہ مجھے پیدا کرنے سے کتنا عرصہ پہلے خدا نے توریت کو لکھا؟ موسیٰ نے کہا، چالیس سال قبل۔

یہ تصور بھی یہودی علما کا تھا جن کے مطابق توریت تخلیق دنیا کے دو ہزار سال پہلے سے موجود تھی۔

گویا اسلام کے مطابق توریت تخلیق آدم سے بھی پہلے لکھی گئی ہے۔ وہ لفظاً خدا کا کلام ہے، اس کی تحریر اور اس کا خط کتابت الٰہی ہے یعنی خدا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس تصور کو قرآن نے من و عن تسلیم کر لیا جو ظاہر ہے توریت میں یہودیوں کے حق میں تھا۔ چنانچہ توریت، کتاب خروج میں لکھا ہے،؛

جب خدا موسیٰ سے کوہ سینا پر کلام کر چکا تو اس نے موسیٰ کو شہادت کی دو تختیاں دیں۔ پتھر کی تختیاں جو خدا کی انگلی کی لکھی ہوئی تھیں۔

توریت کے الفاظ صاف ہیں اور قرآن کے الفاظ میں بھی کوئی ابہام نہیں اور اپنے ظاہری معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ ہمارے کچھ علما جن میں سر سید احمد بھی شامل ہیں، انھوں نے ان واضح آیات کی پرواہ نہیں کی اور تاویلات کا سہارا لیا اور کہا کہ تمام قرآن میں لفظ "کتبنا" جہاں بھی آیا ہے، اس سے خدا کی نسبت فعل کتابت کی مراد نہیں لی گئی بلکہ اس سے مقرر کرنے اور فرض کرنے کے معنی لیے گئے ہیں۔ اس کی مثال وہ "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ" (سورہ انبیا: 105) کی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی نے بھی آج تک زبور کا لکھنا یعنی فعل کتابت کو خدا سے منسوب نہیں کیا، لہٰذا اس کے معنی "فرضنا فی الزبور" ہے۔ لیکن سب سے پہلی تو یہ کہ یہاں صرف لفظ "كَتَبْنَا" کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ "الْأَلْوَاحِ" کا لفظ بھی آیا ہے اور پھر "نُسْخَتِهَا" کا لفظ بھی موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ لکھنے والے نے کتب کے معنی کی دوسرے لفظ "خط" سے تفسیر کی اور "ید" کا لفظ شامل کر کے اس کی قطعی تائید

کردی کہ "كَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ" کے معنی میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہی۔ پھر یہ حدیث بھی اسے تائید کی کمک پہنچا رہا ہے جس کے راوی ابوہریرہ ہیں، کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے فرمایا، "جب خدا نے خلق کو پیدا کیا تو اس نے اپنی کتاب کے اندر لکھا اور وہ لکھا کرتا ہے اپنی ذات پر، اور وہ رکھا ہوا ہے اس کے پاس عرش پر کہ میری رحمت غالب ہے میرے غضب پر۔" (بخاری)

قصہ مختصر، صحیح ہو یا غلط لیکن مسلمانوں نے توریت کو ایسے اعلیٰ درجے پر خدا کا کلام تسلیم کیا ہے جس سے زیادہ قیاس میں نہیں آسکتا بلکہ قرآن کو بھی اس مرتبہ پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اگر کلام اللہ کے لیے فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہونا ضروری ہوتا تو سب سے پہلے یہ صفت ہم توریت میں پاتے لیکن اگر ہمیں یہ فصاحت وہاں نہیں ملتی تو پھر اسے تسلیم کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں بچتا کہ فصاحت کلام اللہ کا جزو نہیں ہے۔ اس کے علی الرغم جنھوں نے کلام اللہ کے ساتھ فصاحت و بلاغت کو مشروط کیا، انھوں نے خود کلام اللہ کی صداقت کی دلیل کو ضعیف کر دیا اور ایک ایسی دلیل پیش کی جو نقص رائے کے زمانہ میں چل سکتی تھی لیکن تحقیق کے آگے نہیں ٹھہر سکتی۔

کیا قرآن نے فصاحت و بلاغت کا دعویٰ کیا ہے؟

سب سے پہلے ان آیات پر ہم ایک نظر ڈال لیتے ہیں جن کی بنا پر علمائے اسلام نے قرآن کو نہ صرف فصیح و بلیغ بلکہ بے مثل تسلیم کر رکھا ہے اور یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ ایسی فصاحت و بلاغت طاقت بشری سے باہر یعنی معجزہ ہے۔ وہ آیات درج ذیل ہیں:

(1) اور اگر تم کو اس (کتاب) میں، جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل فرمائی ہے، کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورۃ تم بھی بنا لاؤ اور خدا کے سوا جو تمھارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ (سورہ بقرہ، 23)

(2) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے، کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورۃ بنا لاؤ اور خدا کے سوا جن کو تم بلا سکو بلا بھی لو۔ (سورہ یونس، 38)

(3) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن از خود بنا لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور خدا کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو، بلا بھی لو۔ (سورہ ہود، 13)

(4) کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم خدا کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں (کتابوں) سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہو تا کہ میں بھی اس کی پیروی کروں۔ (سورہ القصص،49)

ان آیات کو غور سے پڑھیں اور بار بار پڑھیں، آپ کو ان میں ایک بھی اشارہ ایسا نہیں ملے گا جس سے یہ گمان ہو کہ قرآن نے فصاحت وبلاغت میں معارضہ چاہا ہو بلکہ یہاں واضح ہے کہ اس نے مضمون (ہدایت) کے ضمن میں چیلنج کیا ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ اس چیلنج کا جواب قرآن سے پہلے بھی موجود تھا اور اب بھی ہے، لیکن فی الحال ہم اپنی توجہ علمائے اسلام کے اس دعوے پر مرکوز رکھتے ہیں جس کے مطابق قرآن فصاحت وبلاغت میں بے نظیر ہے۔

کسی کلام کے بے نظیر ہونے کا مطلب بلاشبہ یہی ہے کہ اس کے مانند کوئی دوسرا کلام موجود نہیں ہے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے کلام موجود ہیں جن کی فصاحت وبلاغت کی برابری دوسرا کلام نہ کر سکا لیکن وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوئے۔ مثلاً کوئی دوسرا دیوان غالب وجود میں نہیں آیا، ''کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور۔'' لیکن اس کا یہ دعویٰ بھی اسے من اللہ تسلیم نہیں کراتی اور نہ ہی اس کے مداح ایسا کوئی دعویٰ کرتے ہیں۔

اینڈرسن شا نے اپنے مضمون ''قرآن اور معجزہ'' میں ابن الروندی (827-911) کا ایک اقتباس پیش کیا ہے:

> اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ فصاحت میں عرب کا کوئی قبیلہ دیگر قبائل سے بڑھ کر ہو، اور اس قبیلے کا کوئی ایک گروہ باقی قبیلے سے زیادہ فصاحت رکھتا ہو، اور اس گروہ میں کوئی ایک شخص باقیوں سے زیادہ فصیح ہو......اب فرض کریں کہ اس کی فصاحت کی شہرت سارے عرب میں پھیل گئی تو عجم پر اس کا کیا حکم ہے جو زبان نہیں جانتے اور ان پر اس کی کیا حجت ہے؟
>
> تمھارا دعویٰ ہے کہ معجزہ قائم اور موجود ہے جو کہ قرآن ہے، اور کہتے ہو: 'جسے انکار ہو وہ اس کے جیسا لا کر دکھائے'، تو اگر تم برتر کلام چاہتے ہو تو ہم بلغا، فصحا اور شعرا کے کلام سے اس کے جیسا ہزار لا سکتے ہیں جس کے الفاظ اس سے زیادہ رواں، معانی میں بے تحاشا مختصر، ادائیگی اور عبارت میں بلیغ اور تناسق میں باکمال ہو گا۔ تو اگر تمھیں یہ

منظور نہیں تو ہم تم سے وہی مطالبہ کرتے ہیں جو تم ہم سے کرتے ہو۔

اینڈرسن شانے ابن الراوندی کا اقتباس پیش کرنے کے بعد جو نتیجۂ فکر اختراج کیا ہے، وہ بھی لائق غور ہے، ملاحظہ ہو؛

> ابن الراوندی کی بات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہر متن اور مصنف کا اپنا ایک اسلوبی پہلو ہوتا ہے جو اسے باقی لکھاریوں اور تخلیق کاروں سے ممتاز کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر یا مصنف کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے جس کی نقل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، یوں یہ چیلنج دے کر وہ بتارہے ہیں کہ یہی حجت حریف پر بھی لاگو ہوتی ہے، کیوں کہ کوئی بھی انسان کسی دوسرے کے جیسی کوئی چیز نہیں لا سکتا۔ تخلیق کی مثال جیسا کہ جابری کہتے ہیں؛ مصوری، مجسمہ سازی، فلسفہ اور فکر کی طرح ہے جس کی نقل نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ نقل "تخلیق" نہیں ہے۔

حالاں کہ قرآن کا اسلوبی پہلو ایک جیسا نہیں ہے کیوں کہ مختلف لکھاریوں اور تخلیق کاروں کی کاوش کا مشترکہ نتیجہ ہے جسے ہم "قرآن اور اس کے مصنفین" میں تفصیلی طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ قرآن اول تا آخر ایک ہی اسلوب پر نہیں ہے۔ عبارت و بندش، الفاظ و مضامین اور انشاپردازی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں کلام مسجع و مقفیٰ ہے جس کی نثر میں شاعرانہ آہنگ ہے، کہیں آمد ہے، کہیں فکشن کا بیانیہ ہے۔ کہیں زہد خشک اظہار ہے، کہیں امم سابقہ کی مورخانہ سرگذشت ہے اور کہیں حکایتوں کی تکرار ہے۔ المختصر، مختلف لوگوں کا کہا ہوا مختلف درجوں کا کلام ہے؛ کہیں چست ہے تو کہیں سست، کہیں تیکھا ہے تو کہیں پھیکا۔ گویا قرآن ایک ایسے کشکول کی مانند ہے جس میں سینکڑوں متقدمین کا کلام اکٹھا کیا گیا ہے، اگرچہ مصنفوں کے نام ناپید ہو گئے اور سب کا سب ایک ہی سے منسوب کر دیا گیا لیکن اس کے باوجود کلام کی اندرونی و بیرونی ساخت میں وہ امتیاز باقی ہے جس سے مختلف مصنفوں کا کلام جدا جدا معلوم ہوتا ہے۔

اینڈرسن شانے اپنے مضمون میں ابو بکر رازی (854-925) کا حوالہ بھی پیش کیا ہے، جس کے مطابق کسی کتاب میں کوئی معجزہ ہے تو اسے دینی کتابوں میں نہیں بلکہ علمی کتابوں میں ہونا چاہیے۔ رازی کہتے ہیں؛

> واللہ اگر کسی کتاب کا حجت ہونا واجب ہوتا تو وہ انجینئرنگ اور ریاضی کی کتابیں ہوتیں جن سے افلاک اور سیاروں کی حرکت کا علم حاصل ہوتا ہے، اور منطق اور طب کی

کتابیں جن میں بدن کی منفعت کے علوم ہیں۔ یہ کتابیں ایسی کتابوں سے زیادہ حجت کی حقدار ہیں جن سے نا تو کوئی نفع ہوتا ہے، نہ نقصان اور نہ ہی کوئی مستور (پوشیدہ) ظاہر ہوتا ہے (یعنی قرآن)۔

ہم اس سے بہتر شعر، بلیغ خطبے اور خوب صورت رسائل لا سکتے ہیں جو اس سے زیادہ فصیح اور باکمال ہوں گے، قرآن میں ایسا کوئی فضل نہیں ہے، یہ محض کلام کے باب میں ہے۔(''معجزہ اور قرآن'': اینڈرسن شا؛ ''تاریخ الالحاد فی الاسلام'': عبدالرحمٰن بدوی؛ ''مدخل الی القرآن الکریم'')

قرآن کا چیلنج

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً (بنی اسرائیل:88)

فرما دیجیے، اگر تمام انسان اور جنات اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن کے مثل (کوئی دوسرا کلام بنا) لائیں گے تو (بھی) وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

قرآن نے تحدی کے باب میں بار بار لفظ ''مثل'' دہرایا ہے، جیسے ''لیس کمثلہ شئی'' (اس کے جیسی کوئی چیز نہیں۔الشوریٰ:11) یا پھر سورۂ ہود کی آیت 13 اور سورۂ بقرہ کی آیت 23 میں بھی قرآن کو بے مثل بتایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ کسی بھی چیز کے جیسی کوئی چیز کبھی نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ دلیل اسے طاقت بشری سے خارج اور من اللہ ثابت کرتی ہے، لیکن اہل اسلام کی مذہبی جذباتیت کے کردار کے تعین کے لیے ہم سورۂ بقرہ کی آیت کو کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ 'مثل' سے کیا مراد ہے؟

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (سورہ بقرہ:23)

(اور اگر تم اس (کلام) کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور (اس کام کے لیے بے شک) اللہ کے سوا اپنے (سب) حمایتیوں کو بلا لو، اگر تم (اپنے شک اور انکار میں) سچے

ہو۔

"مِّن مِّثْلِهِ"کی ضمیر کے مرجع میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مثل پر جو 'من' کا لفظ آیا ہے، اس سے آیت کے یہ معنی ہو جاتے ہیں کہ اگر محمد جیسا کوئی امی ایسی سورۃ لا سکتا ہے تو پیش کرے۔ امام رازی اپنی تفسیر میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر ضمیر قرآن کی طرف راجع ہو تو اس کا مقتضا یہ ہو گا کہ وہ لوگ قرآن کی مثل لانے سے عاجز ہیں، خواہ جمع ہو کر لائیں یا تنہا۔ خواہ وہ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ۔ اور اگر محمد کی طرف راجع ہو تو اس سے صرف ثابت ہو گا کہ ان میں سے جو بے پڑھے لکھے ہیں، وہ قرآن کی مثل نہیں لا سکتے۔ کیوں کہ محمد کی مثل تو وہ شخص ہو گا جو ان پڑھ اور تنہا ہو۔ اور اگر وہ لوگ مجتمع ہو کر ایسا کریں اور پڑھے لکھے بھی ہوں تو وہ محمد کی مثل نہ ہوں گے، کیوں کہ جماعت واحد کی مثل نہیں ہو سکتی اور نہ ایک پڑھا لکھا کسی ان پڑھ کی مثل ہوتا ہے۔ اگر ہم ضمیر کو قرآن کی طرف راجع کہیں تو قرآن کا معجزہ ہونا اس بات پر مبنی ہو گا کہ قرآن کی فصاحت کامل ہے اور اگر محمد کی طرف راجع کریں تو قرآن کے معجزہ ہونے کی بنیاد اس کلیہ پر ہو گی کہ امی شخص سے ایسا ہونا ناممکن ہے اور اسے قرآن کا اعجاز ثابت ہو جائے گا۔ لیکن محمد کی طرف ضمیر راجع کرنے کا نقصان یہ ہو گا کہ اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص امی ہونے میں محمد کی مثل نہ ہو، وہ قرآن کی مثل لا سکتا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ''مِّن مِّثْلِهِ''کی ضمیر کا مرجع تعین کرنے میں کافی دشواریاں ہیں۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ معارضہ کس بارے میں چاہا گیا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ تحدی میں مخاطب کون لوگ کیے گئے ہیں۔ لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ ان آیات تحدی میں متکلم اپنا مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کرنے سے قاصر رہا۔ گویا کلام میں عیب ہے جو اسے فصاحت و بلاغت کے معیار سے نیچے گرا دیتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مسلمان جس آیت کو قرآن کی فصاحت و بلاغت کے دعوے کی شکل میں پیش کرتے ہیں، اسی آیت میں اتنا بڑا اغلاق ہے کہ مقصود مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آیت میں اغلاق لازمی طور پر موجود ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو قرآن کی لفظی لطافتوں کو اس کا معجزہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان غیر عربوں کے لیے قرآن نے کیا اہتمام کیا تھا جو اس زبان کی لطافتوں کو محسوس

کرنے سے عاجز تھے۔ اس سے بھی بڑی حیرت مجھے اس وقت ہوتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اہل عرب قرآن کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اس پر ایمان نہ لائے تھے جس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں تفصیلی طور پر کریں گے۔ چنانچہ ایسی فصاحت و بلاغت بھلا کس کام کی، اس سے تو بہتر موسیٰ کی لاٹھی تھی جس سے وہ درختوں کے پتے بھی گرا لیتے تھے، اس کے سہارے چل بھی لیتے تھے، اس سے دوستوں کی مدد بھی کرتے تھے اور دشمنوں کو زیر بھی کر دیا کرتے تھے۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ فصاحت کا وجود محض ایک مفروضہ ہے جس سے نہ تو عرب کی تسکین ہوئی اور نہ عجم کی۔ عربوں نے تو خیر اس دعوے کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ رہا عجم تو جو لوگ زبان عربی سے ناواقف تھے یا اس میں انھیں کامل مہارت حاصل نہیں تھی اور اس کے فن معانی، علم البیان اور صنائع و بدائع کو مکمل طور پر جانتے ہی نہیں تھے، انھیں چیلنج کرنا چہ معنی؟ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی اردو جاننے والے شخص کو چیلنج کرے کہ تم سنسکرت کے معروف شاعر "امرو" جیسی ایک نظم لکھ کر لے آؤ۔

میں ایک بار پھر اس بات کو دہرادوں کہ قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے علم ہو سکے کہ اس نے فصاحت و بلاغت کے بارے میں معجزہ ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ خود محمد کو بھی ایسا کوئی وہم نہیں تھا، انھوں نے بھی کبھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ وہ علمائے اسلام کے بر خلاف اس معجزے سے بے بہرہ ہوں اور "کوہ نور" کو انھوں نے "بلور" ہی سمجھا ہو۔

قرآن اور محمد دونوں فصاحت و بلاغت کے باب میں اس درجہ ساکت ہیں کہ جب کفار محمد سے معجزہ طلب کرتے تھے: "وَقَالُوا۟ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَٰتٌ مِّن رَّبِّهِۦ" [اور (کافر) کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں۔ سورہ عنکبوت:50؛ سورہ الانعام:37]، تب بھی محمد نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ اگر علمائے اسلام کا دعویٰ درست ہے کہ فصاحت قرآن کا ایک خاص معجزہ ہے تو ظاہر ہے محمد بھی اس سے واقف ہوتے اور اس کو معجزہ تسلیم کرتے اور کفار کا منھ بند کرنے کے لیے فوراً کہہ دیتے کہ قرآن کی فصاحت خود معجزہ ہے بلکہ معجزۂ مسترہ ہے۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ کفار کیا جواب دیتے لیکن محمد نے تو یہ کہہ کر ان کی ساری امیدیں توڑ دیں کہ "وَمَا مَنَعَنَآ أَن نُّرْسِلَ بِٱلْءَايَٰتِ إِلَّآ أَن كَذَّبَ بِهَا ٱلْأَوَّلُونَ" (اور ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لیے موقوف کر دیں کہ اگلے لوگوں نے اس کی تکذیب کی تھی: سورہ بنی اسرائیل:59)، حالاں کہ یہ سنہرا موقع تھا جب زعمائے اسلام کی طرح محمد کفاروں کو جواب دے سکتے تھے کہ "قرآن خود ایک معجزہ ہے ان لوگوں کے لیے جو ماہرین علم معانی اور علم

بیان ہیں''، لیکن ہم جانتے ہیں کہ محمد نے ایسا کوئی جواب نہیں دیا۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیوں؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے عربوں کی ثقافتی صورت حال کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

کلام اللہ بنام کلام بشر

اگر ہم قرآن کو بلفظ کلام الٰہی تصور کر لیں تو پھر اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس میں کلام بشر بھی موجود ہے جو قریش یا دیگر قبائل عرب کے اقوال سے ماخوذ ہے۔ یہاں سوال کرنے کا دل کرتا ہے کہ کیا قرآن کی اعجازی فصاحت و بلاغت کا دعویٰ مکمل قرآن پر ہے یا کسی خاص جزو سے منسوب ہے؟ حالاں کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ دعویٰ کرنے والے پورے قرآن کو یکساں طور پر فصیح و بلیغ بتاتے ہیں اور اسے طاقت بشری سے خارج قرار دیتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز سورہ بقرہ کی تفسیر کرتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں،

> قرآن میں بعض آیات دوسروں کے کلام سے بطور نقل بھی بیان ہوئی ہیں۔ پس اگر وہ آیتیں انھی عبارتوں کے ساتھ ان سے صادر ہوتی ہیں تو اعجاز قرآن ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ کلام انسانی بھی اس درجہ بلاغت کو پہنچ جائے گا اور اگر اسی عبارت میں ان سے وہ کلام صادر نہیں ہوا تو ان کی نقل مطابق واقع نہیں ٹھہرے گی اور خبر الٰہی کا واقع سے مطابق نہ ہونا امر محال ہے۔

اپنے اس مقدمے کا شاہ صاحب خود ہی جواب اس طرح دیتے ہیں:

> دوسروں کے کلام کا بیان دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ اول یہ کہ دوسرے کا کلام بالکل اسی طرح بیان کر دیں اور اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ نقل معنیٰ کے لحاظ سے کی جائے اور دوسرے کے مطلب کو اپنی عبارت میں بیان کر دیں۔ حکایتیں اور قصے قرآن میں اسی دوسری قسم میں سے ہیں، دوسروں کے کلام کو اپنی عبارت میں نقل فرمایا ہے۔

چلیے تسلیم، تو اب اس بات پر دلیل ہونا چاہیے کہ قرآن میں دوسروں کا کلام لفظاً کہاں نقل ہوا ہے اور بالمعنیٰ کہاں؟ یہ بات محض فرض کر لینے کی نہیں بلکہ غور طلب امر یہ ہے کہ نقل بالمعنیٰ کی ضرورت یا تو اس جہت سے لاحق ہوتی ہے کہ سننے والا بولنے والے کے الفاظ کو بوجہ نقص حافظہ تمام

وکمال ضبط نہیں کر سکتا اور صرف نفس مضمون اس کو یاد رہتا ہے جسے وہ مجبوراً اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے ورنہ اگر کوئی شخص اس بات پر قادر ہو کہ دوسرے کی کہی ہوئی بات بجنسہ بیان کر سکے تو ہر گز نقل بالمعنی کو اختیار نہ کرے گا تاوقتیکہ کوئی کلام بہت طویل ہو جس کا محض خلاصہ وحاصل مطلب اس کو بیان کرنا منظور ہو مگر اس حالت میں بھی وہ صحت روایت کے لحاظ سے قائل کے صحیح الفاظ میں ضرور بیان کرے گا یا نقل بالمعنی کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب بولنے والا دوسری زبان میں کلام کرے اور نقل کرنے والا دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کرے۔ لہٰذا قرآن میں اگر فرعون کا کلام نقل ہوا یا موسیٰ یا دوسرے لوگوں کا، تو روا ہے کہ ہم اسے نقل بالمعنی تصور کریں۔ لیکن اگر خاص اہل عرب کا یا خاص الخاص قریش کا کوئی مخصوص کلام نقل کرنا ہو تو روا نہیں ہے کہ بولنے کے الفاظ میں تصرف کیا جائے۔ کیوں کہ اگر قرآن خدا کا کلام ہے تو خدا کو نقص حافظہ ہو نہیں سکتا اور ہم اس کی توقع ہر گز نہیں کرتے کہ اہل عرب کے کلام کو قرآن میں ہر جگہ نقل بالمعنی کیا ہو اور اگر کیا ہے تو پھر ضرور خلاف واقع ہو گا۔ اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بخاری میں سورہ منافقون کی تفسیر میں زید بن ارقم سے روایت ہے کہ؛

میں اپنے چچا کے ساتھ تھا، میں نے عبداللہ بن ابی سلول کو کہتے سنا، لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا - اور یہ بھی کہ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۔ پس میں نے اس کا ذکر اپنے چچا سے کر دیا اور میرے چچا نے اس کا ذکر رسول اللہ سے کیا۔

لیکن جب عبداللہ کو محمد نے بلا کر پوچھا تو اس نے قسم کھا کر زید کی بات کو جھٹلا دیا جس کا اسے کافی صدمہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد زید بن ارقم کی تصدیق اور منافق کی تکذیب میں وحی نازل ہوئی جس میں بجنسہ وہی الفاظ موجود ہیں جو عبداللہ کے منہ سے نکلے تھے۔

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل کی درج ذیل آیات کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں رقم کرتے ہوئے مطلع فرمایا کہ یہ کلام عبداللہ بن امیہ مخزومی کا ہے:

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ

(اور کہا ہم تجھے ہر گز نہ مانیں گے یہاں تک کہ تو ہمارے لیے زمین میں سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجور اور انگور کا باغ ہو پھر تو اس باغ میں بہت ساری نہریں جاری کر دے۔ یا جیسا تو خیال کرتا ہے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے یا تو اللہ اور فرشتوں کو روبرو لے آ۔ یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور ہم تو تیرے چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے، یہاں تک کہ تو ہمارے پاس ایسی کتاب لے آئے جسے ہم بھی پڑھ سکیں۔)

ہمارے پاس سوائے یہ تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں کہ یہاں لفظ بہ لفظ یہ کلام کافروں کے منھ سے نکلا ہوا ہے اور اس میں ایک حرف کا بھی تصرف نہیں ہوا ہے، کیوں کہ یہاں مخالف کے خیال کو بجنسہ نقل کر کے جواب دینا منظور ہے۔ آداب مناظرہ بھی یہی ہے کہ معترض کی حجت کو اسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے۔ اب ذرا مذکورہ بالا عبارت کو پھر سے پڑھیے اور مجھے بتایئے کہ کفار کا کلام حسن بلاغت میں قرآن سے کس قدر کم ہے؟ اب یا تو آپ اس کے اعجاز کی تصدیق کریں یا پھر پورے قرآن کی فصاحت و بلاغت سے ہاتھ دھو بیٹھیں، یہ فیصلہ بہر حال آپ کو کرنا ہے۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اللہ کو نقل بالمعنی کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اگر آپ کا یہ کہنا ہے کہ نقل بالمعنی محمد نے کی (حالاں کہ یہ بھی آپ کے زعم کے اعتبار سے غلط ہے، کیوں کہ سارے کا سارا قرآن تو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے) تو میں کہوں گا کہ اس سے اعجاز کا مسئلہ باطل ہو جاتا ہے، کیوں کہ محمد بشر تھے اور جو کچھ انھوں نے کہا، وہ طاقت بشری کے اندر تھا۔ اور اگر یہ کلام بھی قرآن کی دوسری عبارتوں کی طرح بے مثل اور اعجازی ہے تو پھر کلام اللہ، کلام بشر کے برابر ہو گیا، یعنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اللہ اور بشر کے کلام میں کوئی مابہ الامتیاز باقی نہ رہا۔

اس سلسلے میں ایک دوسری دلچسپ مثال حضرت سلیمان کا نامہ ہے جو انھوں نے ملکہ بلقیس کو لکھا جس کا ایک اقتباس قرآن میں موجود ہے؛

قَالَتْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ إِنِّىٓ أُلْقِىَ إِلَىَّ كِتَٰبٌ كَرِيمٌ إِنَّهُۥ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُۥ بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ أَلَّا تَعْلُوا۟ عَلَىَّ وَأْتُونِى مُسْلِمِينَ (سورہ النمل: 29-31)

(کہنے لگی اے دربار والو! میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے۔ وہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے۔ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ میرے سامنے تکبر نہ کرو اور میرے پاس مطیع ہو کر چلی آؤ۔)

یہاں چند امور قابل غور ہیں کہ بلقیس کون تھی، کہاں کی تھی، اس کی زبان کیا تھی؟ یہ خط کس زبان میں لکھا گیا تھا؟ ''تفسیر مدارک التنزیل'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ بلقیس شراحیل کی بیٹی تھی اور اس کا باپ ملک یمن کا بادشاہ تھا۔ بلقیس کے علاوہ اس کی کوئی دوسری اولاد نہیں تھی، سو یہی اپنی قوم پر حکومت کرنے لگی۔ اس کی قوم مجوسی یعنی آتش پرست تھی۔ اب یہاں یمن کی تاریخ میں نہیں بتا سکتا، اس کے لیے قارئین کو تمدن عرب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ بہر حال ملکہ بلقیس عرب تھی اور عربی زبان بولتی تھی۔ اصول کی بات یہ ہے کہ جب کسی بادشاہ کی جانب سے غیر ملک کے بادشاہ کے پاس سفارت یا مراسلت کی جاتی ہے تو اسی زبان میں کی جاتی ہے جسے مکتوب الیہ سمجھ سکتا ہو، لہٰذا امریکہ سے جو نامہ پیام ایران کے ساتھ ہوتا ہے وہ فارسی زبان میں ہوتا ہے، چین کے ساتھ چینی میں، جاپان کے ساتھ جاپانی میں وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ حضرت ہدہد جو یہ نامہ سلیمان کی طرف سے بلقیس تک پہنچا گئے تھے، وہ عرب کی زبان میں تھا جسے اہل یمن سمجھ سکتے تھے، چنانچہ فوراً بلقیس نے اسے پڑھ لیا اور درباریوں کو بھی سنا دیا جس پر قرآن شاہد ہے۔

بادشاہوں کے دربار میں ہمیشہ غیر ملکوں کی زبان کے عالم موجود ہوتے ہیں جو ترجمان کا کام انجام دیا کرتے ہیں۔ خود ہمارے اپنے زمانے میں بھی غیر ممالک سے مراسلت یا سفارت کے وقت یہی طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ سلیمان کے تعلقات غیر ممالک کے ساتھ کافی بڑھے ہوئے تھے۔ ممکن ہی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ اس خط کو سلیمان کے دربار کے کسی بڑے منشی نے سلیمان کی طرف سے لکھا ہو جو کم از کم ابو الفضل کے برابر تو ضرور ہو گا۔ دل کرتا ہے کہ وہ عبارت ہمارے ہاتھوں میں ہو جو بلقیس کے خط میں سلیمان کی جانب سے مندرج تھے۔ علامہ نسفی نے بڑی کد و کاوش اور بڑی تحقیق و تدقیق کرکے اپنی تفسیر میں لکھا؛

> سلیمان کی نوشتہ کی یہ صورت تھی۔ خدا کے بندے سلیمان بن داؤد کی طرف سے بلقیس ملکہ سبا کو، شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے، سلامتی ہو ہر کسی پر جو ہدایت کا تابع ہوا۔ واضح ہو کہ تم لوگ مجھ سے سرکشی مت کرنا اور میرے پاس مطیع ہو کر چلے آؤ۔ اس خط پر مشک کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور اس پر انگوٹھی کی مہر بھی کر دی تھی۔

اب اس میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے جو عبارت سلیمان کے خط سے اخذ کی ہے، وہ

بالکل ہو بہو وہی ہے جسے سلیمان کے میر منشی نے لکھا تھا۔اس خط کو ہم الہامی نہیں کہہ سکتے۔یہ ان بے شمار خطوط میں سے ایک ہے جو سلیمان نے بادشاہوں اور حاکموں کو لکھے۔اس کا درجہ زیادہ سے زیادہ محمد کے ان مکتوبات جیسا ہو گا جو آپ نے ہرقل یا کسریٰ یا مقوقس یا نجاشی کو لکھوائے تھے۔لہٰذا یہ کلام اللہ نہ تھا لیکن قرآن میں درج ہے۔ مسلمانوں کو اسے بھی کلام اللہ تسلیم کر لینا چاہیے اور اس خط کی بلاغت وفصاحت کو بھی طاقت بشری سے خارج سمجھ لینا چاہیے۔

المختصر، قرآن میں کثرت سے کلام بشر موجود ہے اور وہ کلام اللہ کی طرح فصیح بھی ہے۔اس لیے یہ کہنا کہ مکمل قرآن فصاحت و بلاغت میں یکتا ہے، جو طاقت بشری سے خارج بھی ہے، آپ ہی غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

اب آیئے طاقت بشری سے خارج کے دعوے کو ہم دوسرے پہلو سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''اتقان'' میں علامہ سیوطی نے بتایا ہے کہ اسباب نزول قرآن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بعض آیات جو پہلے صحابہ کی زبان پر نازل ہو چکی تھیں، وہی بعد میں قرآن شریف پر نازل ہو گئیں۔ میرے قارئین کو خوب اچھی طرح یاد ہو گا کہ میں اپنی کتاب ''قرآن اور اس کے مصنفین'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ میں نے قرآن پر اصحاب محمد کے اثرات کا ذکر لبید بن ربیعہ، حسان بن ثابت اور بطور خاص عمر ابن الخطاب کے حوالے سے کیا تھا۔ علمائے اسلام بھی آج تک اس بات کا فخریہ اظہار کرتے چلے آئے ہیں کہ عمر کے مشوروں پر قرآن کی کئی آیات نازل ہوئیں، حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام نے ایک بار فرمایا، ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔'' علی بھی اس بات کی تصدیق یوں کرتے ہیں کہ ''عمر کی زبان پر فرشتہ کلام کرتا ہے۔'' میں اس بحث کو دہرانا نہیں چاہتا، قارئین سے گذارش ہے کہ وہ میری سابقہ کتاب کی ورق گردانی کر لیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے یہ سوچ کر کہ آخر بندوں کو خدا کے ساتھ یا خدا کو بندوں کے ساتھ توارد کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے اپنے زمانے میں مرزا قادیانی نے نزول قرآن کے اس اصول کو کہ خدا کا بندوں کے ساتھ توارد ہو جاتا ہے، منکرین کو ذہن نشین کرانے کی بہت کوشش کی اور اس مسئلہ کی تمام پیچیدگیوں کو عملی طور پر حل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے خود پر کئی اشعار نازل کرانے شروع کر دیے۔ جب لوگوں نے ٹوکا کہ یہ تو لبید بن ربیعہ کے معلقہ سے چوری کی گئی ہے تو بالکل نہ شرمائے اور ان مولویوں کو احمق قرار دے ڈالا جو کہتے تھے کہ مرزا کی کتابوں میں فلاں فلاں فقرہ دوسری کتابوں سے لیا گیا ہے۔ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے مرزا نے فرمایا، ''یہ اعتراض براہ راست قرآن

پروارد ہوتا ہے، اس کی بعض عبارتیں بعینہ امراؤالقیس وغیرہ کے قصائد میں موجود ہیں... احمدیوں کا حق ہے وہی جواب اس اعتراض کا دے دیں۔"

میرے اپنے خیال میں اس سرقہ یا توارد کی سب سے مناسب تاویل یہ ہوسکتی ہے کہ جس طرح بادشاہ کو ہر رعیت کی زمین کا لگان لینا روا ہے، اسی طرح خدا کو بھی حق ہے کہ وہ کسی بندے کے دماغ کی پیداوار سے نہایت ہی عمدہ کلام اپنے لیے منتخب کرلے۔ اس لیے لبید کے طرف داروں کی شکایت بے جا ہے، اگرچہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے، "چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد۔"

قرآن اور غیر قرآن میں فرق

قرآن اور غیر قرآن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جس کا ثبوت مسلمانوں کی مسلمہ تاریخ میں موجود ہے۔ مثلاً، قرآن کی بعض سورتوں کے باب میں اصحاب رسول کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا۔ عبداللہ بن مسعود سورہ فاتحہ اور معوذتین کو قرآن کی سورت نہیں تسلیم کرتے تھے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود سے بڑھ کر کوئی دوسرا قرآن کے اعجاز کا درک رکھتا تھا؟ لہٰذا، اگر ان سورتوں کا اعجاز فصاحت و بلاغت اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ غیر قرآن سے ممتاز نہیں تھا تو یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی بھی ان کے قرآن ہونے میں شک گذرتا۔

موجودہ قرآن میں سورۃ الیل کی یہ آیت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ عبداللہؓ بن مسعود اور ابو درداء جیسے اصحاب رسول اور ان کے شاگرد تابعین اس آیت کو "مَا خَلَقَ" کے الفاظ کے بغیر پڑھتے تھے اور اسی کو محمد کی تلاوت قرار دیتے تھے۔ صحابی رسول ابودرداء کے الفاظ کی شدت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ موجودہ قرآن کے مطابق اس آیت کو پڑھنے کا کھلم کھلا انکار کرتے بلکہ اسے شام کے لوگوں کا اضافہ قرار دیتے۔

حضرت عائشہ کے آزاد کردہ غلام ابو یونس سے روایت ہے کہ:

> حضرت عائشہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کے لئے قرآن لکھوں اور فرمایا: جب تم اس آیت پر پہنچو حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ تو مجھے بتانا، چنانچہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو انہیں آگاہ کیا، انہوں نے مجھے لکھوایا: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَ صَلٰوۃِ الْعَصْرِ حضرت عائشہ نے فرمایا: میں نے اسے رسول اللہؐ سے ایسے ہی

سنا۔(صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب الدلیل لمن قال: الصلاۃ الوسطیٰ ھی صلاۃ العصر، حدیث:۱۴۲۷)

مشہور تابعی سعید بن جبیر نے کہا حضرت ابن عباس اس طرح آیت کی تلاوت کرتے تھے:
وَكَانَ أَمَامَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ صَالِحَةٍ غَصْبًا اور اس آیت کی بھی یوں تلاوت کرتے تھے:
وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ كَافِرًا وَ كَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب {وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ: لَا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا}، حدیث:۴۷۲۵)

ہمارے پاس موجود قرآن کے مطابق جو سورۃ الکہف کی آیات ۷۹، ۸۰ ہیں لیکن ابن عباس ان آیات کو ہمارے قرآن کے مطابق تلاوت نہیں کرتے تھے بلکہ آیت ۷۹ میں أَمَامَهُمْ پڑھتے جبکہ ہمارے قرآن میں اس کی جگہ لفظ وَرَاءَهُم ہے، اسی طرح اسی آیت میں ابن عباس سَفِينَةٍ صَالِحَةٍ پڑھتے جبکہ ہمارے قرآن میں سَفِينَةٍ کا لفظ سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس سے اگلی آیت ۸۰ میں بھی ہمارے موجودہ قرآن میں كَافِرًا وَ كَانَ کے الفاظ غائب ہیں جو ابن عباس کے مطابق موجود تھے اور وہ تلاوت بھی کرتے تھے۔

الغرض قرآن اور غیر قرآن میں فی نفسہ کوئی امتیاز ایسا نہیں ہے جسے معجزہ سے تعبیر کیا جا سکے اور اگر اعجاز ایسے جید صحابہ پر مشتبہ رہے تو پھر اس کے محض ظنی ہونے میں کیا کلام رہا۔

قرآن اپنی شہادت دینے سے بھی قاصر

جب قرآن کے جمع و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو جو شخص قرآن کا کوئی حصہ لے کر آتا، اس سے گواہی اور قسم لی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر قران کی فصاحت و بلاغت بے نظیر و بے مثل ہوتی تو صحابہ کو بلا تکلف ان حصوں کے بارے میں قرآن اور غیر قرآن کا فیصلہ کرنے کی بابت دشواری پیش نہ آتی، محض نفس کلام سے قرآنیت ثابت ہو جاتی اور لانے والے کی ثقاہت یا اس کے قول پر شہادت یا اس قسم کے دیگر تکلفات کی حاجت نہ پڑتی۔ اگر کسی جوہری کے پاس کوئی شخص جواہر لائے تو اسے لانے والے کی شہادت کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ خود ہی پرکھ لے گا۔ جو دلیل ابن مسعود اور ابی بن کعب کے اختلاف سے حاصل ہوتی ہے، وہی دلیل جامعین قرآن کے اس فعل سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

اب آجایئے تلک الغرانیق والے قصے کی جانب جو نہایت ہی عبرت ناک ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ رسول اللہ قریش کی اسلام سے بے رغبتی پر انتہائی افسردہ و غمگیں تھے، اور قریش کی جانب سے دعوت اسلام کو پذیرائی حاصل نہ ہونے پر سخت مایوس تھے، ان کے دل میں شدت سے یہ چاہت تھی کہ اللہ کی جانب سے کوئی ایسا کلام نازل ہو جو موحدین اور مشرکین کے درمیان دوری کو قربت میں تبدیل کردے۔ ایک مرتبہ پیغمبر اسلام بیت اللہ میں قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر اللہ کی جانب سے وحی کا نزول شروع اور آپ نے سورۃ النجم کی قرأت شروع کی اور جب ان آیات تک پہنچے:

افرأیتم اللات و العزیٰ و مناۃ الثالثۃ الاخریٰ

تو شیطان نے آپ صلعم کی زبان سے یہ الفاظ جاری کرادیئے:

تلك الغرانيق العلیٰ و ان شفاعتهن لترتجی

یہ لات اور منات بہت بلند پایہ کے بت ہیں اور یقیناً
ان کی شفاعت بھی اللہ کے ہاں قبول کی جائے گی

مشرکین آپ کی زبان سے اپنے معبودین کے لیے یہ الفاظ سن کر انتہائی مسرور ہوئے۔ پیغمبر اسلام نے اپنی تلاوت مکمل کرنے کے بعد سجدۂ تلاوت کیا تو اس مجلس میں موجود تمام مشرکین بھی سجدہ ریز ہوگئے اور بیت اللہ میں موجود کوئی بھی مومن اور مشرک ایسا نہ بچا جو سجدہ ریز نہ ہوا ہو۔ اس مجلس میں موجود ولید بن مغیرہ اور ابواحیحہ سعید بن العاص دونوں انتہائی ضعیف تھے اور سجدہ کرنے پر قادر نہ تھے، اس لیے دونوں نے زمین سے مشت بھر مٹی اٹھا کر پیشانی تک لے گئے اور اس پر سجدہ کیا۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی اور قریش کے لوگ بے حد خوش ہوئے کہ آج محمد نے پہلی بار قریش کے معبودین کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا اور انہوں نے کہا کہ آج ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ ہی زندگی اور موت دیتا ہے، وہی رزق دیتا ہے اور تخلیق کرتا ہے اور ہمارے یہ معبود یعنی لات و منات اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے، پس اگر محمد ہمارے معبودوں کو ایسے بہتر الفاظ کے ساتھ یاد کرے گا تو ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔
پھر شام کو جبرائیل پیغمبر محمد کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد! آج تم نے کیا کیا؟ آج تم نے قریش کے سامنے وہ کلام تلاوت کیا جو تم پر اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوا تھا، یہ سن کر محمد بے حد غمگیں ہوگئے اور ان پر خشیت الٰہی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اللہ کو محمد

پر رحم آیا اور محمد کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل کی:

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٖ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلۡقَى ٱلشَّيۡطَٰنُ فِيٓ أُمۡنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ ٱللَّهُ مَا يُلۡقِي ٱلشَّيۡطَٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈال دیتا تھا۔ تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے، خدا اس کو دور کردیتا ہے۔ پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کردیتا ہے۔ اور خدا علم والا اور حکمت والا ہے۔ (تفسیر بغوی، در تفسیر سورۃ الحج 52)

یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ بتوں کی تعریف میں یہ فقرہ کس کی تصنیف ہے؛ محمد کی یا شیطان کی؟ لیکن بہر حال یہ طے ہے کہ محمد ہی نے اسے کلام اللہ کہہ کر مشرکوں کو سنایا اور بعد میں جسے القائے شیطانی قرار دے دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نہ تو محمد نے خود اور نہ مشرکوں نے اس عبارت کو لفظی فصاحت کے اعتبار سے غیر قرآن سمجھا، یعنی کلام اللہ، کلام بشر اور کلام شیطان سب مساوی ہوگئے اور ان میں امتیاز کرنے والا وہاں کوئی اہل زبان موجود نہ تھا۔ حالاں کہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ اللہ کا کلام طاقت بشری سے خارج ہے تو سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اللہ کا کلام طاقت شیطانی کے اندر ہے جسے محمد بھی نہ پہچان سکے؟

Jurat-e-Tehqiq

قرآن اور اہل عرب کی فصاحت و بلاغت

عرب فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار تھے اور فصیح و بلیغ کلام کے شہسواروں میں تھے۔ بلیغ خطابت اور حکیمانہ کلام میں ان کی مہارت مسلم تھی۔ ان کے علاوہ دوسری قومیں اس خصوصیت سے عاری تھیں۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے اور اپنے مافی الضمیر کو وضاحت سے پیش کرنے میں انھیں ایسا ملکہ حاصل تھا جو عقلوں کو ان کی باتوں پر مرتکز کر دیتا تھا۔ برجستہ خطابت اور فی البدیہہ شعر گوئی کا انھیں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ انسان پر حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ شدید سے شدید مراحل میں وہ اپنی تقاریر اور خطبوں میں وہ کلام کے تمام وسائل کو کام میں لاتے تھے، چمکتی ہوئی تلواروں اور ٹکراتے ہوئے نیزوں کے درمیان فی البدیہہ رجزیہ اشعار پڑھا کرتے، مدح کرنے پر آتے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے اور ذم کرنے پر اترتے تو تحت الثریٰ میں پہنچا دیتے۔ یہ زورِ کلام ان کا بہت بڑا وسیلہ تھا جس سے دم کے دم میں وہ ان لوگوں کو ساتھ ملا لیتے جس سے وہ مدد طلب کرتے۔ اشراف خاندانوں کے بچے طوطی و بلبل ہزار داستان کی طرح لطفِ زبان اپنے ساتھ لے کر گویا پیدا ہوا کرتے تھے۔ لونڈیاں تک مختلف مضامین پر ایسے برجستہ اشعار کہہ دیا کرتی تھیں کہ آج اچھے سے اچھا شاعر ان کے برابر کا شعر نہیں کہہ سکتا۔ عکاظ کا تذکرہ قدیم عرب لٹریچر اور تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل یہ بازار اپنے فن، تجارت، شعر و سخن اور لوگوں کے میل ملاپ کا ایک بڑا مرکز تھا۔ عکاظ کے میلے میں جزیرہ نما عرب کے اطراف و اکناف سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ شعر و سخن، ادبی مقابلوں، قصیدہ خوانی، گھڑ دوڑ، تیر اندازی، نیزہ بازی اور جنگی نوعیت کے کھیل عکاظ میلے کی رونق کو چار چاند لگا دیتے تھے۔

قصہ مختصر، ان دنوں شاعری کا چرچا ساتویں آسمان پر تھا اور فصاحت و بلاغت کو لوگ شاعری کا مترادف سمجھتے تھے۔ جس کسی کو اپنی زبان دانی منوانی ہوتی، وہ شعر ہی کے ذریعہ منواتا۔ جاہلیہ کا جو تمدنی اثاثہ ہمارے ہاتھ لگا ہے، وہ اشعار ہی ہیں۔ لہٰذا یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ اہل مکہ کو قرآن سے کس طرح کی فصاحت و بلاغت کی توقع تھی۔ اہل مکہ کے محولہ بالا مزاج کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے

کہ انھیں یہ توقع تھی کہ جو کوئی ان سے مخاطب ہو، اسے چاہیے کہ وہ ان کے فن بیان کے قواعد کا پابند ہو اور شعر میں اپنے معاصرین سے سبقت لے جائے۔ انھوں نے قرآن کو سنا اور اپنے مذاق کے مطابق اسے پھیکا اور ٹھس پایا۔ ان کے شدید اصرار پر قرآن نے کھل کر کہہ دیا کہ ”اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے۔“ (سورہ یٰسین: 69) ظاہر ہے کہ قرآن نے فصاحت و بلاغت کے اس معیار سے ہی اپنا دامن جھاڑ لیا جو اس وقت اہل عرب کے نزدیک مسلم تھا۔ ان کے نزدیک قرآن کا شعر ہونے سے انکار گویا فصاحت و بلاغت سے انکار تھا۔ ظاہر ہے کہ صرف عربی زبان میں اس کا ہونا ان کے لیے کوئی معجزہ نہ تھا۔ پھر بھی یہ معجزہ یا کم از کم عجوبہ اس وقت ہو سکتا تھا جب اسے کوئی عجمی کہتا، کسی اہل زبان کا عربی میں کہنا کیوں کر معجزہ ہو سکتا تھا؟ قرآن نے اس کا رد سورۃ شعرا میں یہ کہہ کر پیش کیا کہ ”اگر ہم یہ قرآن کسی عجمی پر نازل کرتے اور وہ اس کو ان لوگوں کو پڑھ کر سناتا تو بھی یہ لوگ اس پر ایمان نہ لاتے۔“ یہ قرآن کی محض ایک قیاس آرائی تھی جس سے قرآن اس نے مخالفین کی زبان بند کرنی چاہی، جسے ہم عرف عام میں عذر لنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔

کیا اہل مکہ کی نگاہ میں قرآن عجوبہ تھا؟

اہل مکہ کی نگاہ میں قرآن مطلق کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی فصاحت و بلاغت کے انکاری تھے بلکہ وہ یہاں تک کہتے تھے کہ اس کی زبان ایسی ناقص ہے کہ اگر یہ کسی اہل عجم کے لیے باعث فکر بھی ہو اور کسی اہل زبان کے لیے باعث شرم نہ بھی ہو تو بھی خدا کے لیے ضرور باعث رسوائی ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے اس کی ہجو ملیح کی تو یہ کہہ کر کہ ”شاعر ہے“ (سورہ طور: 30) یا ”یہ شعر کہتا ہے“ (سورہ انبیا: 5)۔ لیکن واضح رہے کہ جب کفار محمد کو شاعر کہتے تھے تو اس سے ان کی مراد کوئی مستند شاعر نہیں بلکہ ”شاعر مجنون“ ہوا کرتی تھی جسے ہم اردو میں 'متشاعر' بھی کہہ سکتے ہیں (سورہ الصافات: 36)۔ المختصر، کسی ہم عصر اہل زبان نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بلا جبر و اکراہ تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ تو ہمیشہ اس میں عیب نکالتے رہے اور قرآن کو بہ اعتبار انشا محض لچر ہی ٹھہرایا۔ جس قوم میں فصاحت اور شعر گویا مترادف تصورات تھے، جس سرزمین میں لونڈیاں تک برجستہ اشعار کہہ دیا کرتی تھیں، ان لوگوں کے سامنے یہ کہہ دینا کہ ہم نے نبی کو شعر نہیں سکھلایا، یہ تو بالکل اعتراف شکست

ہے اور سوئے اتفاق یہ کہ محمد اتنے بدذوق واقع ہوئے تھے کہ شعر کہنا تو دور کی بات کسی موزوں شعر کو صحت سے پڑھ دینا بھی آپ پر دشوار تھا۔(اس کی تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ ہو؛''قرآن اور اس کے مصنفین'') اس کے جواب میں مسلمان صفائی دیتے ہیں کہ محمد کو شعر گوئی اس لیے نہیں سکھائی گئی تاکہ قرآن اور بھی بڑا عجوبہ ثابت ہو، کیوں کہ ایک امی شخص جو انشاپردازی کے رموز واسرار سے واقف نہ تھا، وہ بھلا ایسا قرآن کیوں کر کہہ سکتا ہے۔لیکن مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل عصر نے اس کا جو دوسرا نتیجہ نکالا، وہ پہلے کی نسبت زیادہ خطرناک تھا اور وہ یہ کہ کوئی دوسرا زیادہ پڑھا لکھا شخص انھیں سکھلاتا ہے اور آپ اس کا سکھلایا ہوا دہراتے رہتے ہیں۔(سورہ نحل، سورہ فرقان)

میں اب تک یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہوں کہ قرآن کس اصناف سخن میں شمار ہوتا ہے۔وہ نہ تو نثر ہے اور نہ نظم بلکہ زیادہ سے زیادہ دونوں اصناف کا ایک ملغوبہ ہے۔کہیں شاعری کی ہیئت خارجی یعنی عروض، قافیہ وردیف وغیرہ کا اہتمام برقرار رکھا گیا ہے تو کہیں سپاٹ بیانیہ سے کام چلایا گیا ہے۔پھر ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن نے شعر کی ہجو کیوں کی؟ شعر کو تو لوگ ''عطیہ ٔخداوندی'' کہتے رہے ہیں۔یونانی کہتے تھے کہ جس پر ''میوزز''یعنی دیویوں کی مہربانی ہوتی تھی وہی شعر کہہ سکتا تھا۔ہندو اسے سرسوتی سے منسوب کرتے تھے اور عرب جنات سے۔عربوں کا گمان تھا کہ ہر شاعر کا ایک جن ہوتا تھا جو اس پر شعر القا کرتا تھا اور جب ان میں سے کوئی شخص شعر کہنے سے عاجز ہو جاتا تو وہ کہتے کہ اس کا جن اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔مختصر یہ کہ ہر قوم میں شعر کو الہام بتانے کا چلن موجود رہا ہے۔پھر قرآن کو کیا سوجھی جو اس نے شعر کے جمال و کمال سے انکار کر دیا اور وہ شعر نہ ہوا۔مزامیر داؤد شعر ہی تو ہیں یا کچھ اور؟ انبیائے سابقین نے وحی کو کیوں نظم میں ادا کیا؟ مثنوی مولانا روم شعر نہیں تو اور کیا ہے جس کی نسبت ''ہست قرآن در زبان پہلوی'' کہا گیا۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالنے میں برحق ہیں کہ جن فن میں اہل عرب استاد مانے جاتے تھے، اس فن میں قرآن ان سے معارضہ کرنے کو تیار نہ تھا۔اگر معارضہ منظور ہوتا تو قرآن شعر کہہ کر عرب کو چونکا دیتا تاکہ تمام فصحائے عرب یعنی شعرائے قوم جو محض شعر کے سبب سرداری کے منصب پر فائز تھے، قرآن کا لوہا مان جاتے۔اگر قرآن کو اس میدان میں معارضہ منظور تھا تو وہ عکاظ کے اکھاڑے میں معاصر فصحا و بلغا کو للکارتا تاکہ سارے خطیبوں اور شاعروں کا بازار ٹھنڈا پڑ جاتا۔عکاظ کوئی دور نہ تھا، پاس ہی تھا، تیرہ برسوں تک مسلسل وہاں جمگھٹا لگتا رہا، لیکن ہم نے کبھی نہیں سنا کہ

محمد نے کبھی اس میدان سخن میں کسی کو دعوت مبارزت دی ہو یا نقادان سخن سے کچھ داد پائی ہو۔ لیکن رکیے، ہمارے زعمائے اسلام کے ترکش میں ابھی ایک تیر باقی ہے جس سے وہ اکثر فصاحت و بلاغت کا معرکہ سر کرتے رہتے ہیں۔ وہ چھاتی ٹھوک کر بڑے فخر کے ساتھ الولید بن المغیرہ کا یہ قول بخاری سے نقل کرتے ہیں:

اس میں ایک چاشنی ہے اور بے بہار ونق ہے، اس کا اوپر کا حصہ پھل دار ہے اور نیچے کا حصہ راحت بخش ہے، بے شک یہ غالب اور اس پر غالب نہیں ہوا جا سکتا۔

اینڈرسن شا اپنے ایک علاحدہ مضمون ''قرآن اور دعوائے بلاغت'' میں اس پر بڑی دلچسپ رائے دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

تقدیر کا مذاق یہ ہے کہ الولید بن المغیرہ نامی یہ شخص جس کی لغوی اور بلاغی فصاحت کی مثالیں دی جاتی ہیں، محمد پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں تھا، اس کے بر عکس قرآن نے اس غریب کا ذکر بڑی حقارت سے کیا ہے۔ مگر کیا واقعی الولید بن المغیرہ نے قرآن کی مدح کی تھی جیسا کہ حدیث اور اسلامی تاریخ کی کتابیں کہتی ہیں یا قرآن کے بارے میں اس کی رائے کچھ اور تھی؟ یہاں بھی تقدیر کا ایک اور گھناؤنا مذاق یہ ہے کہ قرآن نے الولید بن المغیرہ کی قرآن کے بارے میں رائے نقل کی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن الولید بن المغیرہ کی رائے کی بابت کیا کہتا ہے، خاص طور پر اس لیے کہ مسلمانوں کے نزدیک احادیث اور تاریخ کے مقابلے میں قرآن زیادہ صحت کا حامل ہے:

''اس نے فکر کیا اور تجویز کی۔ یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔ پھر یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔ پھر تامل کیا۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔ پھر پشت پھیر کر چلا اور غرور کیا۔ پھر کہنے لگا کہ یہ تو جادو ہے جو منتقل ہوتا آیا ہے۔ یہ بشر کا کلام ہے۔''

(سورہ مدثر: 18-25)

گویا الولید بن مغیرہ کی قرآن کے بارے میں رائے یہ تھی کہ یہ بشر کا کلام ہے۔ اب وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے احادیث کو پرکھنے کی باتیں کرتے ہیں، وہ لوگ جو اپنے اعتقادات اور تحفظات کو بچانے کے لیے ضعیف اور صحیح کا لاحقہ لگانا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ جو سرے سے احادیث اور تاریخ کے انکاری ہیں، ان کے لیے بخاری کی متعلقہ حدیث بھی اہم اس لیے نہیں ہونی چاہیے، کیوں کہ وہ قرآن سے متصادم ہے۔ لیکن ہمارے علما مغیرہ کے بیان میں شامل ایک لفظ 'سحر' (جادو) سے اس

قدر مسحور ہوئے کہ انھوں نے قرآن کے واضح اعلان کو بھی لائق اعتنا نہیں گردانا اور اس بات پر سر دھنتے رہے کہ دیکھو مغیرہ قرآن کی جادو بیانی کا قائل اور معترف تھا۔

قرآن کو سحر کیوں کہا گیا؟

تاریخ ابن اثیر میں ولید بن مغیرہ کی نسبت لکھا ہوا ہے:

اس نے قریش کو جمع کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ مخلوق حج کے ایام میں یہاں آتے ہیں اور محمد کا حال تم سے پوچھا کرتے ہیں، ان کے جواب میں ہر ایک تم میں سے اپنے خیال کے موافق کہہ دیا کرتا ہے۔ کوئی تو اسے ساحر بتاتا ہے اور کوئی کاہن، کوئی شاعر اور کوئی مجنوں کہا کرتا ہے۔ وہ ان باتوں میں سے کسی کے مشابہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اسے ساحر کہا کرو، کیوں کہ وہ ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے اور مرد کو عورت سے جدا کر دیتا ہے۔

سیرت ابن ہشام (حصہ اول) میں بھی ولید بن مغیرہ کے الفاظ یوں مندرج ہیں؛

تم اس کے متعلق کہو کہ وہ (محمد) جادو گر ہے، وہ اپنا ایک جادو بھرا کلام لے کر آیا ہے جس کے ذریعے باپ بیٹے، بھائی بھائی، میاں بیوی اور فرد خاندان و خاندان کے درمیان جدائی ڈالتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہے کہ مغیرہ نے 'ساحر' یا 'سحر' کا لفظ کن معنوں میں استعمال کیا تھا۔ اس کی نظر میں محمد کی تعلیم اقربا میں نفاق ڈالنے والی اور اہل عرب کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنے والی تھی۔ ظاہر ہے اس کا یہ تجزیہ درست بھی تھا کیوں کہ اسلام مسلمانوں اور کافروں کے درمیان نفرت اور بیگانگی کی لکیر کھینچ دیتا ہے اور انسانوں کو دو خانے میں تقسیم کر دیتا ہے۔

ہمارے خوش عقیدہ مسلمان اپنے ممدوح یعنی ولید بن مغیرہ کا وہ بیان بھی بھول جاتے ہیں جس میں اس کم بخت نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ محمد پر تو وحی نازل ہو اور مجھے چھوڑ دیا جائے۔ حالاں کہ میں قریش کا بڑا شخص ہوں اور سردار قریش ہوں اور ابو مسعود، عمرو بن حمیر الثقفی کو چھوڑ دیا جائے جو بنی ثقیف کا سردار ہے۔ پس ہم دونوں ان دونوں بستیوں کے بڑے ہیں۔“ ولید بن مغیرہ کے اس بیان کی تصدیق قرآن بھی سورہ الزخرف:31 میں کرتا ہے، ”اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟“

قرآن سے لفظ 'سحر' کی سند

لفظ 'سحر' کے لفظی معنی خواہ کچھ بھی ہوں لیکن یہاں اس سے مراد افترا ہے۔اس کی سند میں قرآن اور تاریخ دونوں سے پیش کر سکتا ہوں۔

وَلَئِن قُلْتَ إِنَّكُم مَّبْعُوثُونَ مِن بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (اور اگر تم کہو کہ تم لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ سورہ ھود: 7) یہاں قرآن خود گواہی دے رہا ہے کہ کفار خبر بعث کو جادو یعنی جھوٹ سمجھتے تھے۔امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ؛

> اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کلام کا انکار کرتے تھے اور خبر حشر پر باطل کا حکم لگاتے تھے۔......اس قول ''یہ کچھ نہیں مگر کھلا جادو ہے'' کے معنی یہ ہوئے کہ جادو ایک امر باطل ہے جیسا خدا نے حضرت موسیٰ سے حکایتاً بیان کیا کہ جو کچھ تم جادو بنا کر لائے، اللہ اس کو ضرور باطل کر دے گا۔پس اس قول ''وہ کچھ نہیں مگر کھلا جادو'' سے صرف یہ مراد ہے کہ یہ بطلان صریح ہے۔سوم یہ کہ قرآن حشر اجساد کے ہونے کا حکم لگاتا ہے اور کافر قرآن پر سحر ہونے کا طعنہ مارتے تھے، کیوں کہ اصل پر طعن کرنا اس کے فرع پر طعن کرنے کا فائدہ دیتا ہے (یعنی جب قرآن کو ہم نے باطل اور دروغ کہہ دیا تو گویا اس سب کو باطل و دروغ کہہ دیا جو کہ قرآن کے اندر ہے۔)
>
> هَٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ - أَفَسِحْرٌ هَٰذَا أَمْ أَنتُمْ لَا تُبْصِرُونَ " (یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔تو کیا یہ جادو ہے یا تم کو نظر ہی نہیں آتا۔ سورہ طور: 14-15) اس آیت میں بھی مطلب صاف ہے کہ تم اس آگ کو سحر کہتے تھے یعنی جھٹلاتے تھے، اب دیکھ لو یہ سچ ہے یا جھوٹ۔

ایک دوسری جگہ ہاروت ماروت کے قصے میں امام رازی لکھتے ہیں؛

> مسئلہ اول اس بات کے بیان میں کہ سحر کے معنی لغت میں کیا ہیں؟ پس ہم کہتے ہیں کہ اہل لغت نے ذکر کیا ہے کہ اصل میں سحر اس چیز کا نام ہے جس کا سبب مخفی اور دقیق ہو اور سحر بالنصب غذا کو کہتے ہیں، اس واسطے کہ پوشیدہ وقت میں کھائی جاتی ہے۔لبید کا شعر ہے؛ ونسحر بالطعام و بالشراب۔اس شعر کے دو معانی بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ ہم دھوکہ دیے جاتے ہیں جس طرح مسحور دھوکا دیا جاتا ہے۔دوسرا معنی یہ

ہے کہ ہم غذا دیے جاتے ہیں اور خواہ کوئی معنی لیے جائیں، اس میں پوشیدگی پائی جاتی ہے۔

مسئلہ دوم: جاننا چاہیے کہ سحر کا لفظ عرف شرع میں اس امر کے ساتھ خاص ہے جس کا سبب مخفی اور حقیقت کے خلاف معلوم ہو اور ایک قسم کا دھوکا دہی اور فریب ہو اور جب اس کو مطلق بیان کیا جاتا ہے تو اس کے فاعل کی مذمت کی جاتی ہے، جیسا اس آیت میں ہے "سَحَرُوٓا۟ أَعْيُنَ النَّاسِ"(تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا: سورہ اعراف:116) [یعنی نظر بندی کر دی۔]مراد یہ ہے کہ انھوں نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا کہ لوگ ان (جادو گروں) کی رسیوں کو اور لاٹھیوں کو چلتا ہوا سمجھنے لگیں۔ (تفسیر کبیر، صفحہ 419)

خلاصہ بحث یہ ہے کہ جب کبھی کفار نے قرآن کو سحر کہا تو اس پر بانسوں اچھلنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ انھوں نے اس لفظ کا استعمال بطور مذمت کیا تھا، جیسا کہ اس لفظ کو ولید بن مغیرہ نے اپنے محولہ بالا بیان میں تراشا تھا۔اس کا مطلب واضح تھا کہ قرآن اہل عرب کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنے والا ہے، دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں میں تفرقہ ڈالنے والا ہے یا اس معنی میں کہ اس سے لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مکہ میں قرآن کی تحدی

مکہ میں نہ تو قرآن خوانی کا کبھی بازار گرم ہوا اور نہ تحدی و تعلی کا۔ تیرہ برسوں تک اہل مکہ نے قرآن کا سنجیدگی سے نوٹس ہی نہیں لیا، البتہ اسے مذاق کا نشانہ ضرور بنایا۔ مکہ میں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، قرآن چیلنج کرتا بھی تو کیسے؟ خود محمد مکہ میں بلند آواز سے قرآن پڑھنے کی جرأت نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ قرآن نے بھی منع کیا، ''وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ''(اور نماز بلند آواز سے نہ پڑھو۔ سورہ بنی اسرائیل:110) اس آیت کا پس منظر صحیح بخاری میں ابن عباس سے یوں مروی ہے کہ ''رسول اللہ مکہ میں چھپے ہوئے تھے اور جب اپنے اصحاب کے ساتھ نماز میں بآواز بلند قرآن پڑھتے تو مشرکین اس کے نازل کرنے والے اور اس کے لانے والے کو گالیاں دیتے۔''

جب ابوذر غفاری مکہ میں محمد کو ڈھونڈتے ہوئے آئے تو انھیں پوشیدہ پایا۔ بڑی مشکل سے ان کا پتہ لگایا، علی نے انھیں بڑے حیلے اور بہانوں سے محمد تک پہنچایا۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل میں عبداللہ بن صامت کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کو جب سب لوگ سو جاتے تھے تو محمد اپنے ساتھی ابو بکر کے ساتھ کعبہ کی زیارت کو نکلتے تھے اور ابوذر سے رات کو ملاقات ہوئی۔ اب یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب خود قرآن پہنچانے والا منھ لپیٹے چھپتا پھر رہا تھا تو قرآن کو پڑھ پڑھ کر اور چیلنج کر کے سنانے والا کون باقی تھا؟ اور کون اعجاز قرآن کا معترف تھا؟

ہجرت حبشہ کے وقت قرآن خوانی بالکل بند تھی۔ عام مسلمانوں کو جانے دیجیے، خاصان رسول ابو بکر صدیق کا یہ حال تھا کہ ان کے ایک کافر ہمدرد ابن دغنہ نے جب انھیں مکہ میں امان دی تو اس نے یہ قول و قرار لے لیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو مگر مکان کے اندر، نماز پڑھو تو مکان کے اندر، جو جی آئے وہ پڑھو لیکن مکان کے اندر، ہم لوگوں کو تکلیف مت دو اور نہ اس کا اعلان کرو۔ (بخاری) لیکن چونکہ ابو بکر رقیق القلب واقع ہوئے تھے، اس لیے جب وہ قرآن دھیمی آواز میں پڑھتے تو اپنی بے بسی پر بہت روتے تھے۔ نتیجتاً ابو بکر سے امان واپس لے لی گئی اور بالآخر ان کو اور محمد کو مکہ چھوڑ کر مدینہ بھاگنا پڑا۔ ادھر ابو جہل نے اعلان کر دیا تھا کہ ''اگر میں نے کبھی محمد کو کعبہ کے گرد نماز پڑھتے دیکھا تو اس کی گردن پیر سے کچل ڈالوں گا۔'' (بخاری، راوی ابن عباس) حتیٰ کہ

عقبہ ابن ابی معیط نے تو کعبہ کے پاس آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر چادر سے آپ کا گلا تقریباً گھونٹ ہی دیا تھا کہ ابو بکر نے اسے روکا۔ (بخاری، راوی عروہ بن زبیر)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کا چیلنج کرنا تو در کنار، مکہ میں مسلمان اعلانیہ نماز تک نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ باآواز بلند قرآن کی تلاوت کر سکتے تھے، اور نہ ہی کعبہ کا طواف کر سکتے تھے۔ وہ تو امان پانے کے لیے ادھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ پہلے حبشہ بھاگے، پھر مدینہ۔ لیکن جو مسلمان مکہ میں باقی رہ گئے تھے، ان کی حالت بدستور ناگفتہ بہ رہی۔ یہ کیفیت اس دن تک رہی جب تک مکہ فتح نہ ہوا اور اسلام کا بول بالا نہ ہوا۔ چنانچہ سعد بن معاذ عمرہ کی ادائیگی کے سبب مکہ میں امیہ کی امان میں رہے اور امیہ بڑی حکمت سے ایک دن دوپہر کے وقت جب لوگوں کی چہل پہل کم تھی، انھیں طواف کعبہ کی غرض سے اپنے ہمراہ لے کر چلا لیکن راستے میں ابو جہل سے ٹکر ہو گئی۔ ابو جہل نے سعد بن معاذ کو للکارا کہ تم محمد اور اس کے یاروں کو مدینہ میں پناہ دیتے ہو اور کعبہ کے طواف کے لیے یہاں آتے ہو۔ اس پر ان کے درمیان کافی تو تو میں میں ہوئی۔ امیہ نے ظاہراً ابو جہل کی طرف داری کی لیکن اپنے دوست سعد کو بچا لیا۔ (صحیح بخاری، راوی ابن مسعود)

لیکن ہمارے زعمائے اسلام ان تاریخی شہادتوں کے باوجود ایک زمانے سے ڈینگیں مار رہے ہیں کہ قرآن کی للکار کے آگے مکہ کے فصحا اور بلغا عاجز ہو کر چپ ہو جاتے تھے اور سر جھکا لیتے تھے۔

سورہ بقرہ کی وہ آیت جس پر علما اینڈتے پھرتے ہیں، اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں یعنی، وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (سورہ بقرہ: 23)

"اور اگر تم اس (کلام) کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور (اس کام کے لیے بے شک) اللہ کے سوا اپنے (سب) حمایتیوں کو بلا لو، اگر تم (اپنے شک اور انکار میں) سچے ہو۔"

یہ آیت مدنی ہے یعنی اس وقت نازل ہوئی جب محمد کی عددی طاقت بڑھ گئی تھی، لہٰذا قرآن اپنے آگے پیچھے اس طاقت کو دیکھ کر مکہ سے سینکڑوں میل دور انھیں چیلنج کرتا نظر آرہا ہے جو ظاہر ہے کہ مضحکہ خیز تھی۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیت کا ذکر بھی ہم اوپر کر چکے ہیں: "قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لا یاتون بمثله و لو کان بعضهم لبعض ظهیراً" (بنی اسرائیل: 88)

”فرما دیجیے، اگر تمام انسان اور جنات اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن کے مثل (کوئی دوسرا کلام بنا) لائیں گے تو (بھی) وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مدد گار بن جائیں۔“

یہ سورہ مکی ہے لیکن محولہ بالا آیت مدنی ہے اور اس کی تصدیق صاحب ”اتقان“ علامہ جلال الدین سیوطی کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق کئی مکی سورتوں میں مدنی اور کئی مدنی سورتوں میں مکی آیات درج ہو گئی ہیں۔ علامہ سیوطی واضح کرتے ہیں کہ سورہ بنی اسرائیل جو مکی ہے، اس میں مذکورہ بالا آیت اس سے خارج ہے یعنی وہ مکی نہیں بلکہ مدنی ہے۔

لہٰذا، تیرہ برسوں تک کسی مائی کے لال میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ کفار مکہ کو چیلنج کرتا اور نہ ہی ان تیرہ برسوں میں فصحا و بلغا نے قرآن کو کبھی منھ لگایا۔ اس وقت نہ لبید بن ربیعہ نظر آتے ہیں نہ حسان بن ثابت، نہ عباس بن مرداس قرآن کو داد دیتا نظر آتا ہے نہ ذویب الھذلی، نہ کعب بن زہیر اور نہ ہی نابغہ جعدی، بلکہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کو مہجور (چھوڑا گیا، فراق زدہ) کہا۔ اب اگر مکہ سے باہر نکل کر قرآن چیلنج کرنے لگا تو ظاہر ہے کہ غلبۂ اسلام کے بعد محمد کے ہاتھ میں تلوار آئی اور پانسہ پلٹ گیا، اب اس جبر واکراہ پر فخر کرنا کتنا درست ہے، یہ فیصلہ میں کسی غیر جانب دار شخص کی فہم وبصارت پر چھوڑتا ہوں۔

مدینہ میں جب اسلام کی عددی قوت بڑھ گئی اور کفار مکہ کو شکست ہونے لگی تو قرآن خوانی رجز خوانی میں بدل گئی جس سے دشمنوں کے دلوں پر ہیبت ڈالی جاتی تھی اور انھیں اس کا لوہا منوایا جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں جنگ بدر سے قبل کا ایک واقعہ اسامہ بن زید کی زبانی مروی ہے کہ جنگ بدر سے پہلے میں اور رسول اللہ دونوں آگے پیچھے ایک گدھے پر سوار ہو کر سعد بن عبادہ کی بیمار پرسی کو جا رہے تھے کہ ایک مجلس کے سامنے سے گزرے جس میں مشرکین بھی شامل تھے، مسلمان بھی اور یہودی بھی تھے۔ اس میں عبداللہ بن ابی بھی بیٹھا تھا جو ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس نے ناک پر چادر ڈال کر حقارت کے ساتھ محمد سے کہا کہ کیوں گرد اڑاتے ہو؟ اور جب محمد مجلس میں بیٹھ کر لوگوں کو قرآن سنانے لگے تو وہ طنزیہ بولا: ہماری مجلس میں اس کلام سے سمع خراشی نہ کر، جو تیرے پاس جائے تو اس کو قصے سنا۔ اس کے بعد مشرکوں، یہودیوں اور مسلمانوں میں گالی گلوچ شروع ہو گئی، محمد نے بیچ بچاؤ کیا اور وہاں سے رنجیدہ اور ناکام پھرے۔ یہی راوی آگے چل کر کہتا ہے کہ جب محمد بدر کی لڑائی جیتے اور کافروں کے رئیس اور قریش کے سردار مارے گئے اور قیدیوں کو پابہ

زنجیر کر دیا گیا تو عبداللہ بن ابی اور اس کے مشرک ساتھی ڈر گئے، انھوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ اسلام غالب آ چکا ہے، اس لیے بھلائی اسی میں ہے کہ محمد کے ہاتھوں بیعت کر لو اور آخر کار یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

درج بالا واقعہ سے ظاہر ہے کہ جو لوگ محمد کے گدھے کی بو تک سے ناک بند کر لیا کرتے تھے اور قرآن کو سمع خراشی سے تعبیر کیا کرتے تھے، وہ اپنے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار دیکھ کر کس آسانی سے اسلام اور قرآن کے قائل ہو گئے۔ قصہ مختصر، تلواروں کی جھنکار کی آواز بلند ہونے لگی، کفار کی ہجویں لکھی جانے لگیں اور ڈنکے کی چوٹ پر اب قرآن کفار کو چیلنج دینے لگا۔ لیکن افسوس اس وقت، جب اس چیلنج کو قبول کرنے والا کوئی باقی ہی نہیں رہا، کیوں کہ کفار کی تعداد بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ چاروں طرف مومنین نظر آ رہے تھے، وہاں نہ تو اب کفر بچا تھا اور نہ کفار۔ چنانچہ بخاری میں عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن محمد اونٹ پر سوار ہو کر بآواز بلند قرآن پڑھتے جاتے تھے، یہ وہی جگہ تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے کسی مسلمان کی مجال نہ تھی کہ وہ زیر لب بھی قرآن پڑھ سکے۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ محمد نے منادی کر دی کہ جو کوئی قرآن کو آہنگ اور للکار سے نہ پڑھے، وہ ہمارا نہیں۔ (صحیح بخاری، راوی ابوہریرہ) لہٰذا اب قوت تھی، للکار تھی، چیلنج تھا، تحدی تھی لیکن اگر کچھ نہیں تھا تو اس کے سننے والے اور جواب دینے والے نہیں تھے؛ مختصر میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا معجزہ ''سیف'' تھا۔

اعجاز قرآن کی ناکامی

مسلمانوں کا مرغوب دعویٰ ہے کہ قرآن کے چیلنج کے سامنے کفار مکہ عاجز ہو چکے تھے اور ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ اس چیلنج کا جواب دیتا۔ اگرچہ گذشتہ باب میں اس دعوے کے بخیے مختلف زاویوں سے ادھیڑے جا چکے ہیں کہ مکہ کے زمانے میں قرآن نے کوئی ایسا چیلنج ہی پیش نہیں کیا اور یہ چیلنج کس بھی معنی اور زاویے سے ہو، اہل عصر نے اسے خاطر میں کبھی نہیں لایا۔ پہلے قرآن نے ایک سورہ کی مثل بنا کر لانے کو کہا (سورہ بقرہ: 23)، جب لے آیا گیا تو پھر اپنے مطالبے میں اضافہ کر کے دس سورۃ بنا لانے کا چیلنج پیش کیا (سورہ ھود: 13)، یہ مطالبہ بھی کفار کی جانب سے پورا کر دیا گیا۔ اب اللہ میاں کے پسینے چھوٹ گئے، انھوں نے آخری چیلنج پیش کیا (سورہ القصص: 49) کہ اس جیسی پوری کتاب لے آؤ۔ گویا ہر بار جب کفار نے چیلنج کا جواب دیا تو قرآن نے اپنا مطالبہ بڑھا دیا۔ بالآخر اس نے فریق ثانی کو گالیاں دینی شروع کر دیں، ملاحظہ فرمائیں؛

> اور وہ جو کوشش کرتے ہیں ہماری آیتوں میں ہار جیت کے ارادے سے، وہ جہنمی ہیں۔ (الحج: 51)
>
> اور جنھوں نے ہماری آیتوں میں ہرانے کی کوشش کی، ان کے لیے سخت درد دینے والے عذاب کی سزا ہے۔ (سورہ سبا: 5)

یہ کیا بات ہوئی، پہلے تو آپ نے چیلنج کیا اور جب آپ کا چیلنج پورا کر دیا گیا تو آپ نے بجائے sportsmanship دکھانے کے اپنے فریق کو کوسنا اور گالیاں دینی شروع کر دیں؟ ہمیں اللہ سے ایسی اخلاقیات کی امید نہیں تھی۔ اگر شکست سے اتنی ہی چڑ ہے تو پھر دعوت مبارزت دینی ہی نہیں تھی اور نرگسیت کے مارے لونڈے کی طرح تنہائی میں خود کو آئینے کے سامنے نہارتے رہنا تھا اور سوچتے رہنا تھا کہ مجھ سے زیادہ حسین اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

نضر بن حارث

ابن ہشام لکھتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ مجلس میں بیٹھے ہوئے اللہ کی طرف لوگوں کو

دعوت دے رہے تھے اور قرآن سنا کر اہل قریش کو اس افتاد سے ڈرا رہے تھے جو گزشتہ امتوں پر پڑی۔ نضر بن حارث آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور ان لوگوں کو رستم و اسفندیار اور شاہان فارس کے قصے سنائے اور کہا کہ قسم خدا کی محمد مجھ سے بہتر قصہ سنانے والے نہیں ہیں۔ ان کے قصے کیا ہیں، سوائے اس کے کہ اگلے لوگوں کے نوشتے جو انھوں نے لکھ رکھے ہیں جیسا کہ میں نے لکھ رکھے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، محمد نے فوراً جبرئیل کو آواز دی اور وہ حاضر:

> اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو محض جھوٹ ہے جسے اس نے بنا لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی ہے، پس وہ بڑے ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ پہلوں کی کہانیاں ہیں کہ جنھیں اس نے لکھ رکھا ہے، پس وہی اس پر صبح و شام پڑھی جاتی ہیں۔ کہہ دو کہ اسے تو اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں جانتا ہے۔ بے شک وہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ (سورہ الفرقان، 3-6)

نضر بن حارث جنگ بدر میں اسیر ہوا۔ سیرت حلبیہ میں علامہ سیوطی کی کتاب اسباب نزول کے حوالے سے ایک روایت بیان کی گئی ہے جسے انھوں نے درست قرار دیا ہے۔ روایت کچھ یوں ہے:

> حضرت مقداد نے نضر بن حارث کو گرفتار کیا تھا۔ اس کے بعد جب رسول اللہ نے نضر کے قتل کا حکم دیا تو مقداد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، یہ میرا قیدی ہے (کیوں کہ آنحضرت یہ اعلان فرما چکے تھے کہ جس شخص نے جس قیدی کو گرفتار کیا، وہ اسی کا غلام ہوگا)۔ حضرت مقداد کی یہ بات سن کر آپ نے ان سے فرمایا کہ یہ کتاب اللہ کے بارے میں بدزبانی کیا کرتا تھا۔ غرض صفرا کے مقام پر آپ کے حکم سے نضر بن حارث کو قتل کر دیا گیا۔ (سیرت حلبیہ، جلد دوم، نصف آخر، صفحہ 51)

دربار محمد میں ساری خطائیں معاف ہو سکتی تھیں لیکن بھلا قرآن یا محمد کے چیلنج کا جواب دینے والے کو کیسے بخشا جا سکتا تھا۔

مسیلمہ بن حبیب

مسیلمہ کا تعلق قبیلۂ بنو حنیفہ سے تھا۔ مسیلمہ نبوت میں محمد کو اپنا شریک مانتا تھا۔ اس نے محمد کو جو خط لکھا تھا، اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ''مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی

طرف۔ آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ نبوت کے منصب میں شریک کیا گیا ہوں۔"

مسیلمہ کا سب سے بڑا عقیدت مند نہار تھا، جس کا شمار بنو حنیفہ کے شرفا میں ہوتا تھا۔ نہار نے محمد سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن یمامہ لوٹ کر وہ مرتد ہو گیا اور مسیلمہ کی نبوت پر ایمان لے آیا۔ نہار کا مسیلمہ کی جماعت میں وہی مرتبہ تھا جو محمد کے گروہ میں ابو بکر کا تھا۔

مسیلمہ کا کہنا تھا کہ اس پر بھی وحی نازل ہوتی ہے، "سیرت حلبیہ" جلد سوم، نصف آخر، صفحہ 184 پر اس پر اتری دو وحی کا ذکر موجود ہے۔ ایک بار اس نے کہا:

لقد انعم الله علی الحبلیٰ اخرج منها نسمةً تسعیٰ من بین شغاف وحشاً

(اللہ نے حاملہ عورت پر انعام کیا کہ اس سے دوڑتا ہوا بچہ نکلا۔ یہ بچہ جھلی اور آلائش سے پاک نکلا ہے۔)

ایک اور موقع پر اس نے اپنی ایک وحی یوں سنائی:

والطاحنات طحناً والعاجنات عجناً والخبزات خبزاً والثاردات ثرداً واللاقمات لقماً

(قسم ہے ان عورتوں کی جو گیہوں پیسنے والی ہیں اور آٹا گوندھنے والی ہیں اور پھر روٹی پکانے والی ہیں اور ثرید تیار کرنے والی ہیں اور پھر اس سے لقمے بنانے والی ہیں۔)

اسی طرح تفسیر ابن کثیر (سورۂ بقرہ، صفحہ ۱۰۶) میں مذکور ہے کہ عمرو بن عاص (جب یہ مسلمان نہیں ہوئے تھے) مسیلمہ کذاب کے پاس گئے تو مسیلمہ نے ان سے پوچھا کہ تم مکہ سے آرہے ہو تو بتاؤ آج کل کوئی تازہ وحی بھی نازل ہوئی ہے؟ عمرو بن عاص نے کہا، ابھی ابھی ایک مختصر سی سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر انھوں نے سورہ والعصر پڑھ کر سنائی۔ مسیلمہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا، مجھ پر بھی ایک ایسی ہی سوت نازل ہوئی ہے، "یا وبریا وبر انما انت اذنان وصدر و سائرك حقر فقر"۔

ہمارے حساب سے مسیلمہ کے نام سے منسوب یہ سارے اقوال نقلی اور جعلی ہیں جنھیں مفسرین اور مورخین نے محض اسلام کے دفاع کے لیے گڑھے ہیں۔ اینڈرسن شا نے اپنے مضمون "قرآن اور دعوائے بلاغت" میں مسلم بن حبیب (کذاب) پر ایک فکر انگیز طویل پیرا گراف رقم کیا ہے، جو اس معاملے کے سبھی تاریک پہلوؤں کو روشن کر دیتا ہے:

میں نے مسلم بن حبیب سے منسوب متون کا کافی مطالعہ کیا ہے جو سارا کا سارا اسلامی تاریخ کی کتابوں میں درج ہے اور کوئی ایک بھی ایسا مخطوطہ آج تک دریافت نہیں ہوا جو یہ تصدیق کر سکے کہ یہ کلام واقعی مسلم بن حبیب کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے مخالفین کا ذکر اسلامی کتابوں میں تحقیر ہی سے کیا جائے گا اور کیا جاتا بھی ہے، تو کیا یہ متون مسلم بن حبیب کے ہیں یا اس سے بہتاناً منسوب ہیں؟ اس سوال کی وضاحت اس اعتقاد کی سادہ لوحی میں مضمر ہے کہ یہ متون واقعی مسلم بن حبیب کے ہیں، اپنے قرآن کی بے ہودگی کے باوجود جیسا کہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ مسلم بن حبیب عربوں کے ایک بہت بڑے طبقے کو اپنی نبوت کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسلامی تاریخ خود ہی ردت کی جنگوں میں مسلم بن حبیب کی فوج کے سامنے اسلامی فوج کی شکست کا ذکر کرتی ہے، مسلمانوں کے خلیفہ ابو بکر کے دور میں عکرمہ بن عمرو المخزومی کی قیادت میں ایک فوج مسلم بن حبیب سے لڑنے کے لیے بھیجی گئی مگر اسے بدترین شکست کا سامنا ہوا اور عکرمہ کو اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ وہاں سے بھاگنا پڑا اور تب تک انتظار کرنا پڑا جب تک خالد بن ولید کی قیادت میں ایک نئی فوج نہیں بھیج دی گئی۔ اسلامی مورخین کے مطابق اس جنگ میں مسلم بن حبیب کی فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ یہ تو محض اس کی فوج کی تعداد ہے، اس پر ایمان لانے والوں کی کل تعداد کتنی رہی ہو گی؟ مسلم بن حبیب کی نبوت کو ماننے والوں کو اپنے ایمان کے دفاع میں موت تک منظور تھی، اسی طرح جس طرح مسلمانوں کو تھی۔ یہ بھلا کون سا ایمان ہے جو مسلم بن حبیب جیسے احمق نے ان کے دلوں میں ڈال دیا تھا؟ کیا اس زمانے میں لوگوں کو بیوقوف بنانا اتنا ہی آسان تھا کہ مسلم بن حبیب جیسا شخص جو اسلامی مورخین کے مطابق چار شعر ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا تھا، لوگوں کو بیوقوف بنا سکتا تھا؟ اگر معاملات ایسے ہی ہیں تو پھر اس دور کے اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے بارے میں بھی کئی سوالات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ کیا وہ لوگ جہلاً ایمان لائے تھے، لالچ کی وجہ سے ایمان لائے تھے یا دلیل کی وجہ سے؟ مسلم بن حبیب اتنے سارے لوگوں کو اپنی نبوت کا اس طرح قائل کرنے میں کیسے کامیاب ہو گیا کہ وہ اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر ڈالیں؟ یہاں دو ہی امکان ہیں:

(1) عربوں کی فصاحت وبلاغت کے بارے میں ہماری معلومات درست نہیں ہیں اور ان کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

(2) مسلم بن حبیب سے منسوب وہ قرآن جو ہم تک پہنچا ہے، جعلی ہے۔

ان سب میں اگر ہم یہ بات بھی شامل کر لیں کہ مسلم بن حبیب الحنفی کی نبوت محمد کی نبوت سے پہلے تھی، اور یہ کہ مسلم بن حبیب عربوں میں "رحمٰن الیمامۃ" کے نام سے مشہور تھا اور یہ کہ جب محمد نے مشرکین قریش سے کہا کہ "اسجدوا للرحمٰن" (رحمٰن کو سجدہ کرو) تو انھوں نے کہا، "ما نعرف الا رحمٰن الیمامۃ" (ہم تو صرف یمامہ کے رحمٰن کو جانتے ہیں)؛ یعنی مسلم بن حبیب۔ ہم یہ سوال کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ محمد اپنی نبوت کہاں سے اور کیسے لائے؟ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کے معاملے میں کون کس کی نقل کر رہا تھا؟ محمد، مسلم کی یا مسلم محمد کی؟ لیکن اگر ہم یہ جان لیں کہ مسلم بن حبیب کی نبوت محمد کی نبوت سے پہلے تھی تو ہم یہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ کون سا متن زیادہ پرانا ہے، ایسی صورت میں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ کیا محمد، مسلم کے قرآن کی نقل کر رہے تھے؟

تاریخ کی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ مسلم بن حبیب نامی یہ شخص عربوں میں بہت محبوب شخص تھا، اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ عرب کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ العیدروس الحسینی نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے:

بدیعاً احوماً غنجاً لعوباً

ظریفاً وجهه حاذ الوسامة

بمفرق شعره والحسن يبدى

صباحى والدجى من فوق بامة

رنا ريماً واسفر بدر رتم

وصال مثقفاً وشدا حمامة

وصدق العشق اوقفنى عليه

فسلوانى مسيلمة اليمامة

توگویا مسیلمہ کوئی برا شخص نہیں تھا بلکہ عربوں میں اس کی ایک الگ شان اور اعلیٰ مقام تھا، تو کیا ایک ایسے شخص سے ایسے فرسودہ متون منسوب کیے جا سکتے ہیں؟ یا عرب اتنے الو کے پٹھے تھے کہ اس کے ایسے بیہودہ کلام سے ہی متاثر ہو کر اس پر ایمان لے آئے تھے جیسا کہ اسلامی تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے؟

اسود عنسی

تاریخ طبری کی مانیں تو اسود عنسی نے کتب عتیق اور کچھ رسومات کے امتزاج سے یمن میں ایک نئی آئیڈیالوجی کی بنیاد رکھی۔ اس کی باتیں مسجع اور مقفیٰ نثر میں ہوا کرتی تھیں جو لوگوں کو مسحور کر دیتیں۔ وہ ایک جانباز جنگجو بھی تھا، چنانچہ اس نے پہلے نجران اور بعد ازاں یمن کے دارالسلطنت صنعا کو فتح کیا۔ صنعا کے وہ اعرابی جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، وہ اسود عنسی کے کلام کی فصاحت و بلاغت سے زیادہ متاثر ہوتے چلے گئے اور اسلام کی رسی تڑا کر اس کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔ گروہ در گروہ اور قبیلہ در قبیلہ لوگوں نے خود کو اس کے حوالے کرنا شروع کر دیا۔ بہت ہی قلیل مدت میں اسود نے تمام یمن پر طائف و بحرین اور حدود عدن پر اپنا تسلط جما لیا۔ ان علاقوں کے بیشتر مسلمانوں نے بھی اسلام کو خیر باد کہہ کر اسود کا کلمہ پڑھ لیا۔ (طبری)

عنسی کہتا تھا کہ اس کے پاس بھی ایک فرشتہ آتا ہے جس کا نام ذوالنون ہے، جیسے محمد کے پاس جبرئیل آتا ہے۔ محمد نے جب یہ بات سنی تو اس کی تصدیق کی کہ عنسی نے آسمان کے ایک بہت عظیم فرشتے کا نام لیا ہے جس کو ذوالنون کہا جاتا ہے۔ (سیرت حلبیہ)

طبری نے اسود عنسی کے بارے میں سیف سے کئی روایتیں نقل کی ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ جہاں جہاں فرشتے کا ذکر آیا ہے، طبری نے اس کی جگہ ”شیطان“ لکھ دیا ہے جو اسے عالم غیب کی خبر دیتا تھا۔ طبری کے ہی مطابق جب اسود عنسی یمن پر مسلط ہوا تو اس نے یمن کے ایرانی بادشاہ ”شہر بن باذان“ کو قتل کیا اور اس کی بیوی کے ساتھ شادی کی (اسود کی اس سنت کو پیغمبر اسلام بھی کئی غزوات میں پوری کرتے چلے آئے ہیں)۔ اسود نے یمن میں مقیم ایرانیوں کی سرپرستی کو کمانڈر فیروز اور آزادبہ نامی دو ایرانی نسل کے اشخاص کے ذمہ رکھی اور اپنے تمام فوجیوں کے کمانڈران چیف کے طور پر قیس بن عبد یغوث کو نامزد کیا۔

پیغمبر اسلام نے مدینہ سے ان تین افراد کو نام خط لکھ کر انھیں بغاوت پر اکسایا کہ وہ اسود

عنسی سے جنگ کریں اور اسے نیست و نابود کر دیں۔ان تینوں باغیوں نے آپس میں اتحاد کر لیا لیکن اسود کو اس کے فرشتے نے اس سازش سے آگاہ کر دیا۔اسود نے قیس کو اپنے پاس بلا کر کہا؛

اسود: قیس! یہ میرا فرشتہ کیا کہتا ہے؟

قیس: کیا کہتا ہے؟

اسود: میرا فرشتہ کہتا کہ تم نے اس قیس کا اتنا احترام کیا ہے اور اسے لشکر کی کمانڈری اور اعلیٰ عہدے تک ترقی دے دی ہے، حتیٰ کہ وہ احترام و شخصیت میں تمھارا ہم پلہ بن گیا۔اب اس نے تیرے دشمن کے ساتھ ہاتھ ملا کر فیصلہ کیا ہے کہ تیری سلطنت نابود کرے اور اس نے اپنے دل میں مکر و فریب چھپا رکھا ہے۔یہ فرشتہ مجھ سے کہتا ہے، اے اسود! اے اسود! اے بدبخت! اے بدبخت! قیس کے سر کو تن سے جدا کر دو، ورنہ وہ تجھے قتل کر ڈالے گا۔

اس پر قیس نے کہا؛"تیری جان کی قسم اسود! میرے دل میں تیرا مقام اور منزلت اس سے بالاتر ہے کہ تیرے بارے میں برا سوچوں اور تیری نسبت خیانت کروں۔"

لیکن اسود شاید قیس کے دوغلہ پن کو بھانپ چکا تھا، اس نے کہا؛"اے مردود! تم کتنے ظالم ہو کہ میرے فرشتے کو بھی جھٹلاتے ہو۔معلوم ہوتا ہے کہ اب اپنے عمل پر پشیمان ہوئے ہو اور جو کچھ میرے فرشتے نے خبر دی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرے بارے میں بدنیتی سے منحرف ہوئے ہو۔"

طبری نے سیف سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ قیس اسود کی مجلس سے اٹھ کر چلا گیا اور اس روداد کو اپنے ان دوستوں کے سامنے تفصیلاً بیان کیا جن کے ساتھ اس نے اسود کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

اسود نے دوسری بار قیس کو اپنے پاس بلا کر کہا؛"کیا میں نے تجھے تیرے کام کی حقیقت کے بارے میں آگاہ نہیں کیا؟ لیکن تم نے مجھ سے جھوٹ کہا اور پھر فرشتہ مجھ سے کہتا ہے: اے بدبخت! اے بدبخت! اگر قیس کے ہاتھ تم نے نہیں کاٹے تو وہ تیرے سر کو قلم کر دے گا۔"

قیس نے اپنی چرب زبانی کا سہارا لے کر اسود کو جذباتی کرنا شروع کر دیا؛"میں تجھے ہرگز قتل نہیں کروں گا، تم خدا کے پیغمبر ہو لیکن تم میرے بارے میں جو مصلحت

سمجھتے ہو،اسے انجام دو کیوں کہ ترس واضطراب کی حالت میں سر قلم ہونا میرے لیے ناگوار ہے۔ حکم دو تاکہ مجھے قتل کر دیا جائے کیوں کہ میرے لیے ایک بار مرنا اس سے بہتر ہے کہ ہر روز خوف وہراس سے مروں اور پھر زندہ ہو جاؤں، نیز ذلت کی زندگی سے مرنا بہتر ہے۔"

سیف کہتا ہے کہ اسود پر قیس کی اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے اندر کے تمام شکوک و شبہات رفع ہو گئے۔ آخر کار ان تین افراد نے جنھوں نے اسود کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس کی بیوی کو بھی اس سازش میں شریک کر لیا۔ جب وہ اسود کی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو فیروز نے اسے قتل کرنے میں پیش قدمی کی۔ اسود کو اس کے "فرشتے" نے بیدار کر دیا اور دشمن کے داخل ہونے کی اسے اطلاع دی۔ چونکہ اسود اس وقت گہری نیند میں سویا ہوا تھا، اس لیے آسانی سے بیدار نہ ہوا۔ لہٰذا اس فرشتے (یا بقول سیف کے شیطان) نے خود فیروز کو وحشت میں ڈالنے کے لیے اسود کے روپ میں اس سے مخاطب ہوا اور کہا: "فیروز! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" جب فیروز نے یہ جملہ سنا تو اس نے اسود کی گردن پر ضرب لگائی اور وہ دم توڑ بیٹھا۔ سیف کہتا ہے کہ اس کے بعد فیروز کے دوسرے ساتھی داخل ہوئے تاکہ اسود کے سر کو اس کے تن سے جدا کر دیں، لیکن اسود کا فرشتہ (؟) اس کے بے جان جسم میں داخل ہوا اور اسے حرکت دیتے ہوئے اس کے سر کو تن سے جدا کرنے میں رکاوٹ ڈالنے لگا۔ دو افراد اسود کی پیٹھ پر سوار ہو گئے اور اس کی بیوی نے اس کے سر کے بال مضبوطی سے پکڑ لیے تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے، آخر کار چوتھے شخص نے اس کے سر کو تن سے جدا کر دیا۔ اس وقت اسود کے اندر سے ایک خوفناک آواز نکلی جو گائے کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی۔ جب محافظوں کے کانوں تک یہ آواز پہنچی تو وہ کمرے کے دروازے تک آ گئے اور شور و غل کا سبب پوچھا۔ اسود کی بیوی نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا، "کوئی خاص بات نہیں ہے، پیغمبر پر وحی نازل ہو رہی تھی۔"

یہ تھا اسود عنسی کے افسانے کا خلاصہ جسے طبری نے سیف کی گیارہ روایتوں کے حوالے سے بیان کیا ہے اور ذہبی نے بھی ان روایتوں کو "تاریخ الاسلام" نامی اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

تاریخ ابوالفدا میں ہے کہ "اس اسود کا یہ حال تھا کہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے مسخر اور تابعدار کیا کرتا تھا، جو شخص اس کے کلام کو سنتا، اسی وقت اس کا دل پابند اس کی طرف ہو جاتا۔" خود

طبری اس بات کا معترف ہے کہ اسود عنسی کا کلام نہایت فصیح تھا۔

قصہ مختصر، یہ کہنا کہ قرآن کے چیلنج کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، محض مسلمانوں کی خوش عقیدگی ہے۔ قرآن ہی کیا، مسیلمہ اور اسود عنسی تو مدعیان نبوت بھی تھے اور نہ صرف انھوں نے قرآن کے چیلنج کا جواب دیا بلکہ وحی اور نبوت کے دعوے کی برابری بھی کر کے دکھادی۔

لیکن یہ حیرت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم ان ناقدین سخن کو دیکھتے ہیں جو قرآن اور اسلام مخالف بھی نہ تھے، جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا گیا تو انھوں نے بھی اسے کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا۔ مثلاً سوید بن صامت ایک معروف شخص تھا جس کو اس کی قوم نے شجاعت، فصاحت، شرافت اور حسب ونسب کے اعتبار سے کامل مان لیا تھا۔ جب اس کی شہرت محمد کے کانوں تک پہنچی تو خود بہ نفس نفیس اس سے ملے اور سوید کو خدا کی طرف دعوت دی۔ سوید نے محمد سے پوچھا کہ میرے پاس جو چیز ہے، کیا اس کی مثل تیرے پاس کوئی چیز ہے؟ محمد نے دریافت کیا کہ تیرے پاس کیا ہے؟ سوید نے جواب دیا کہ اس کے پاس ''صحیفۂ لقمان'' ہے۔ محمد نے کہا کہ مجھے اس میں سے کچھ سنا۔ سوید نے اس میں سے آپ کو پڑھ کر سنایا۔ آپ نے فرمایا، یہ کلام خوب ہے لیکن میرے پاس جو ہے وہ اس سے افضل ہے اور وہ قرآن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے، وہ ہدایت اور نور ہے۔ پھر محمد نے سوید کو قرآن میں سے کچھ سنایا اور اسے اسلام کی طرف بلایا۔ سوید نے سن کر کہا، ہاں یہ کلام خوب ہے۔ اس کے بعد وہ مڑ کر چل دیا اور اپنی قوم کے پاس مدینہ جا پہنچا۔ (ابن ہشام)

لقمان موحد حکیموں میں سے ایک تھا، بلکہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ وہ نبی تھا۔ سوید کے پاس اسی کی کتاب تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لقمان کے پیروکاروں میں سے ایک تھا۔ محمد نے جب لقمان کا کلام سنا تو کہا کہ ''خوب ہے''، اور یہی فقرہ سوید نے بھی تکلفاً اس وقت ادا کیا جب اس نے محمد کا کلام (قرآن) سنا اور منہ موڑ کر چلتا بنا۔

لقمان کا جو کلام سوید نے پڑھا تھا، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا تھا اور نہ اب ''صحیفۂ لقمان'' موجود ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ قرآن کے سورہ لقمان میں جو مضامین نازل ہوئے وہ شروع میں لقمان کی زبان پر نازل ہو چکے تھے۔ اس سورہ کی ابتدا میں لکھا ہے، ''تِلْكَ ءَايَٰتُ ٱلْكِتَٰبِ ٱلْحَكِيمِ'' (یہ حکمت کی کتاب کی آیتیں ہیں)، پھر آگے لکھا ہے، ''وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا لُقْمَٰنَ ٱلْحِكْمَةَ'' (اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی)۔ اس سے یہ تو ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ لقمان کی حکمت کو آسمانی حکمت تسلیم کر لیا گیا

اور میرے خیال میں اس سورہ کی آیات کو ''صحیفہ لقمان'' سے ماخوذ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔اس سورہ میں جو یہ آیت ہے: ''وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ءَايَٰتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِىٓ أُذُنَيْهِ وَقْرًا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ''(اور جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اکڑ کر منھ پھیر لیتا ہے، گویا ان کو سنا ہی نہیں جیسے ان کے کانوں میں ثقل ہے، تو اس کو درد دینے والے عذاب کی خوش خبری سنا دو۔)اس کے شان نزول میں مفسرین ہم کو نضر بن حارث کا قصہ سناتے ہیں، جب کہ اس کا شان نزول سوید بن صامت کا قصہ ہے جس کا ذکر ہم ابن ہشام کے حوالے سے اوپر نقل کر چکے ہیں۔ یہاں صاف اشارہ ہے کہ سوید بن صامت قرآن سن کر تکبر سے پیٹھ موڑ کر چلا گیا اور نہایت بددلی سے اس نے قرآن کے بارے میں وہی فقرہ دہرانے پر اکتفا کیا جو محمد نے کلام لقمان سن کر کہا تھا۔ گویا اس نے قرآن کو کلام لقمان سے بہتر تسلیم نہیں کیا۔اس آیت میں جو ''بِعَذَابٍ أَلِيمٍ'' کا فقرہ ہے، اس سے مراد سوید کا قتل ہے جو محمد سے ملاقات کے کچھ دنوں بعد ہی خزرج کی قوم نے انجام دے دیا تھا۔

عہد نبوت کے فصحا وبلغا

جیسا کہ میں اپنی گذشتہ کتاب ''قرآن اور اس کے مصنفین'' میں تفصیلی طور پر عرض کر چکا ہوں کہ آج ہمیں اسلام سے سو برس سے پہلے سات معلقات کے سوا ادب اور انشائے عرب کی کوئی تصنیف نہیں ملتی۔ عرب کا وہ قدیم و عالیشان تمدن جس کا آفتاب طلوع اسلام کے وقت نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، اسے اور اس کے علمی اثاثے کو فتح مکہ کے بعد نیست ونابود کر دیا گیا جس سے مقابلہ کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا تھا۔ اس کے بر عکس ہمارے آس پاس آج بھی وہ قدیم ترین قومیں موجود ہیں جنھوں نے ہزاروں سال پہلے کے اپنے علمی اثاثے پر آنچ نہیں آنے دی، مثلاً یونان، روم اور ہندوستان کے سلف کا گراں مایہ کلام ہمارے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کے بر خلاف مسلمانوں نے پورے عرب کی تاریخ کو صرف پندرہ سو برسوں میں سمیٹ کر رکھ دیا، چنانچہ اب اس تمدن کے تعلق سے ہماری ہر معلومات انھی کی مرہون منت ہو کر رہ گئی ہے۔ ورقہ بن نوفل، ابن رشد، رازی، فارابی، الکندی، ابوالعلا المعری وغیرہ کی کتنی کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں؟ مسیلمہ بن حبیب کا وہ قرآن کہاں ہے جس کے بارے میں مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جھوٹا تھا۔ جاہلیہ کی کتابیں چھوڑیں، مسلمانوں نے تو اسلام کے زمانے کی کئی کتابوں کو گم کر ڈالا۔ صحف قرآن کا سارا کتب خانہ جو خلیفہ عثمان کے عہد تک تیار ہو چکا تھا، آن کی آن میں خاکستر ہو جانے دیا۔ کسی غیرت مند مسلمان نے کسی ملک میں کوئی صحیفۂ قرآن بچا نہ رکھا، پھر بھی ہم سے یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ ہم گمشدہ کتابوں کا پتہ بتائیں؟ گمشدہ کتابوں کو تلاش کرنے کا شوق ہے تو پھر عبداللہ بن مسعود کا صحیفۂ قرآن، علی کا جمع کیا ہوا قرآن، ورقہ بن نوفل کی الکتاب العربی، لقمان کا صحیفۂ حکمت اور وہ مابین الدفتین جو خود محمد نے بطور ترکہ چھوڑا تھا، انھیں ڈھونڈیں اور ہمیں بھی مہیا کرائیں۔

فتح مکہ کے بعد کوئی غیر مسلم ہی وہاں باقی نہ رہا جو قرآن کے خلاف زبان ہلانے کی جرأت کرتا۔ کفار مکہ کے بعد صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ رہ گئے تھے جو قرآن سے معارضہ کر سکتے تھے لیکن جب محمد وفات کے وقت وصیت کر گئے کہ اہل کتاب جزیرۂ عرب سے نکال دیے جائیں تو پھر کوئی اہل زبان غیر مسلم باقی نہ رہا جو قرآن کے چیلنج کا جواب دینے پر آمادہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو یہ زیبا نہیں کہ کسی غیر اہل زبان اہل کتاب سے قرآن کا معارضہ طلب کرے۔ اگر مدینہ

کے یہود نے جو اہل زبان تھے، انھوں نے جلاوطن سے قبل قرآن کی مثل کوئی کلام پیش بھی کیا ہوگا یا معارضہ میں کچھ کہا بھی ہوگا تو اغلب ہے کہ اس پر بھی حکومت اسلام نے پردہ ڈال دیا ہوگا اور ان سب کو مٹا ڈالا ہوگا۔

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ عہد نبوت میں وہ کون سے فصحا و بلغا تھے جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر اس پر ایمان لے آئے تھے؟ اہل اسلام کی خوش فہمیوں سے قطع نظر، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان ہو جانے کے سینکڑوں اسباب ہو سکتے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں کئی ایسے اشخاص گذرے ہیں جنھیں قرآن کی فصاحت و بلاغت کی خبر تک نہ تھی، مثلاً معروف پاپ سنگر جینیٹ جیکسن یا مشہور باکسر مائک ٹائسن وغیرہ جیسے لوگ تو عربی زبان تک سے نابلد تھے۔ لہٰذا، اسی طرح اگر کوئی عرب مسلمان ہو جائے تو یہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کی دلیل نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ اس شخص کے اسلام قبول کرنے کی خاص وجہ فصاحت قرآن نہ اعلان کیا جائے۔ کسی شاعر کے مسلمان ہونے کو قرآن کی فصاحت کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا، بالکل اسی طرح جیسے کسی جالینوس زمانہ کے اسلام قبول کرنے پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن شفا الامراض ہے، اس کی آیتوں کی تلاوت سے مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں، اسی لیے فلاں حکیم مسلمان ہو گیا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مسلمان ان پرانے آزمودہ لیکن از کار رفتہ دلائل اور کند ہتھیاروں سے اعجاز قرآن ثابت کرنے کی بجائے مضبوط ترین شہادتوں اور تاریخی حوالوں سے اپنا موقف ثابت کرنے کی کوشش کریں تاکہ مسلمانوں کی خوش اعتقادی کے ساتھ ساتھ غیر مسلم قارئین کو بھی تسکین میسر ہو سکے۔

مسلم علما ایک لمبی فہرست ایسے لوگوں کی پیش کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام کے ہاتھوں مسلمان ہوئے اور ان میں اکثر بہت بڑے شاعر بھی شامل تھے۔ اس فہرست میں زید بن حارثہ جیسے شعرا کا نام بھی شامل ہے جن کی شاعری کا شہرہ صرف مسلمانوں تک محدود ہے لیکن غیر مسلموں کے کانوں تک نہیں پہنچ پایا۔ اس فہرست میں علی ابن طالب کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے سات یا آٹھ برس کی عمر میں اس وقت اسلام قبول کیا جب وہ یہ تک نہیں جانتے تھے کہ شاعری کس چڑیا کا نام ہے اور بعد میں بہت بڑے شاعر کہلائے جانے لگے۔ اگر اس فہرست کے تمام لوگوں پر میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو میری یہ تحریر بھی "اسد الغابہ فی معرفت الصحابہ" ہو جائے۔ چنانچہ میں اس فہرست میں سے صرف ان مشاہیر کا نام منتخب کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جنھیں علما بڑے پائے کا فصیح و بلیغ تصور کرتے ہیں اور ان کا قبول اسلام اعجاز قرآن کی شہادت تسلیم

کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا تذکرہ میں اپنی کتاب "قرآن اور اس کے مصنفین" میں بھی کر چکا ہوں۔

لبید بن ربیعۃ بن مالک ابو عقیل العامری

لبید کا تعلق بنو عامر صعصعۃ سے تھا جو قبیلہ ہوازن کی ایک ذیلی شاخ تھا۔ واضح رہے کہ ان کی ایک نظم بھی معلقات کا حصہ تھی۔ حافظ ابن عبدالبر اور بعض دوسرے اہل سیر کے مطابق لبید نے 9 ہجری میں اسلام قبول کیا، اس وقت ان کی عمر بہ اختلاف روایت 90 یا 113 سال تھی۔ جب کہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ لبید 145 سال کی عمر میں بمقام کوفہ وفات پائی۔

لبید کے قبول اسلام کے تعلق سے بڑے بڑے دعوے پائے جاتے ہیں اور ان دعوؤں کو قرآن کی فصاحت و بلاغت کے علاوہ کلام الٰہی ہونے کے ثبوت کے طور پر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ میں اپنی گذشتہ کتاب "قرآن اور اس کے مصنفین" میں لبید کے قبول اسلام کے متعلق تفصیلی طور پر عرض کر چکا ہوں، چنانچہ میں متعلقہ حصہ یہاں اپنے قارئین کے لیے نقل کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

جان ڈیون پورٹ کے مطابق لبید نے قرآن کی کچھ آیات کو کعبہ پر آویزاں دیکھا اور شرما کر اپنے قصیدے کو اتار لے گئے اور مسلمان ہو گئے۔ خلیفہ محمد حسن کہتے ہیں کہ "یہی وجہ تھی لبید جیسا صاحب طرز شاعر بے اختیار بول اٹھا کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے اور فوراً مسلمان ہو گیا کیوں کہ بہ سبب اس کمال واقفیت اور مہارت کے جو فن فصاحت و بلاغت میں اسے حاصل تھی، وہ اس بات کو جانچنے کی قابلیت رکھتا تھا کہ انسان ایسا کلام کر سکتا ہے یا نہیں۔" (اعجاز التنزیل، صفحہ 503)

لبید بن ربیعہ کے قبول اسلام کی طرف، خیر اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ شعرائے عصر کا سرتاج بھی تھے اور بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ لیکن یہ بات ہر گز سچ نہیں کہ وہ قبل غلبۂ اسلام مسلمان ہوئے اور کعبہ پر چند آیات قرآنیہ کو آویزاں دیکھ کر اور شرما کر اپنے قصیدے کو اتار لے گئے۔ میں یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ "قبل غلبۂ اسلام" کوئی آیات قرآنیہ کبھی کعبہ پر آویزاں کی گئی یا کعبہ کی چار دیواری کے اندر للکار کر سنائی گئی ہو۔ جان ڈیون پورٹ کا محولہ بالا دعویٰ بلا حوالہ و بلا سند ہے۔ حالاں کہ لبید کے احوال زندگی معتبر تاریخ اسلام میں موجود ہیں جن سے اس دعوے کا رد بآسانی کیا جا سکتا تھا۔ میں اسے مختصراً یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

چھٹے سال بعثت تک لبید اسلام کے دشمنوں کے ہم نشین اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانے والے ہم کو مکہ میں ملتے ہیں۔ابن اثیر کا بیان ہے کہ ایک دفعہ وہ مکہ آئے تو اہل مکہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔انھوں نے اس وقت اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ایک دن ایسی ہی ایک محفل میں وہ اپنا قصیدہ سنا رہے تھے، جب یہ مصرع پڑھا؛''الا کل شئ ما خلا اللہ باطل ''(خبردار رہو کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے)تو صحابیٔ رسول عثمان بن مظعون جو اس مجلس میں موجود تھے، بے اختیار پکار اٹھے: ''تم نے سچ کہا۔''لیکن جب لبید نے دوسرا مصرع پڑھا؛''وکل نعیم لامحالۃ زائل ''(اور ہر نعمت لا محالہ زائل ہونے والی ہے)، تو عثمان بن مظعون بول اٹھے؛''یہ غلط ہے، جنت کی نعمتیں ابدی ہیں اور کبھی زائل نہ ہوں گی۔''اس پر سارے مجمع میں شور مچ گیا، لوگ عثمان بن مظعون کو برا بھلا کہنے لگے اور لبید سے یہ شعر دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔اس نے شعر کی تکرار کی تو عثمان نے بھی اپنے الفاظ کا اعادہ کیا۔اس پر لبید سخت برافروختہ ہوئے اور قریش سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''اے برادران قریش!خدا کی قسم پہلے تمھاری مجلسوں کی یہ کیفیت نہ تھی، نہ ان میں بیٹھنا کسی کے لیے باعث ننگ وعار تھا اور نہ کبھی بدتمیزی نے ان میں راہ پائی تھی۔اگر یہ شخص مجھے اسی طرح ٹوکتا رہا تو میں اپنا کلام سنا چکا۔''لبید کی باتیں سن کر مشرک بھڑک اٹھے اور انھوں نے عثمان بن مظعون کو برا بھلا کہنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ (سیرۃ ابن ہشام)

9ہجری کا نام سنۃ الفود کہا جاتا ہے (ابن ہشام)، کیوں کہ قبائل عرب کے ایلچی آنے لگے اور مسلمان ہونے لگے۔بنی عامر کی طرف سے لبید کا اخیافی بھائی اربد بن قیس، عامر بن الطفیل کے ساتھ رسول اللہ کے پاس مدینہ آیا۔یہ شخص آنحضرت کو دھوکے سے قتل کرنے آیا تھا، مگر اس کو موقع نہ ملا اور ناکام لوٹ گیا۔جب کہ طبقات واقدی میں ہے کہ اس عامر نے جو لبید کا رشتہ میں بھائی تھا، رسول اللہ کے ساتھ گستاخانہ کلام کیا تھا اور رسول اللہ نے اسے بددعا دی تھی۔چنانچہ جب یہ لوگ لوٹے تو راہ میں عامر طاعون میں مبتلا ہو کر مر گیا اور اربد کے اوپر بجلی گری۔لبید کو اپنے ان بھائیوں کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔انھوں نے ایک مرثیہ میں اربد کی شجاعت وسخاوت کی بڑی ہی مبالغہ آمیز تعریفیں کیں اور اس کی نیک خوخصلت کی مدح سرائی کی لیکن اس میں ایک بیت بھی ایسا نہیں ہے جس سے لبید کے دل میں اسلام کی رمق تک نظر آئے۔(ابن ہشام، تنزیہ الفرقان)

اب جب یہ سب ہو چکا اور اسلام غالب آیا تو کچھ حیرت نہیں کہ لبید بن ربیعہ نے اسلام قبول کر لیا، جیسا کہ ''کتاب الاغانی''(الجزاالرابع عشر، صفحہ 93-94)میں درج ہے،''لبید اپنے بھائی

اربد اور عامر کی موت کے بعد بنی کلاب کے ایلچیوں میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہوگئے۔" چنانچہ لبید کا قرآن کو فصاحت وبلاغت کا سرٹیفکٹ دینا بالکل بے سود اور ناقابل قبول ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ سو برس کا بڈھا شاعر ان 13 برسوں تک کہاں تھا جب رسول اللہ مکہ میں قرآن کے سننے والوں کو کوچہ و بازار میں تلاش کرتے پھرتے تھے؟ اس زمانہ میں جب قرآن اس کی حمایت کا ازبس محتاج تھا، لبید نے اس کی دادرسی کیوں نہیں کی؟ اگر فصاحت وبلاغت قرآن کا خاص الخاص معجزہ تھا اور وہ اہل عرب کے فصحا و بلغا کے مذاق کے عین مطابق تھا، تو لبید فن فصاحت و بلاغت میں کامل مہارت اور واقفیت رکھنے کے باوجود اس کی طرف مائل کیوں نہیں ہوئے؟ جب سورۃ اقرا، مدثر یا مزمل یا لیل یا فجر یا ضحےٰ نازل ہوئیں تو انھوں نے اسلام قبول کیوں نہیں کیا؟ حیرت ہے کہ لبید جیسے شاعر کو قرآن کی فصاحت وبلاغت دریافت کرنے میں اتنی مدت لگ گئی اور انھوں نے اس مبارک زمانے کو ضائع کر دیا جب وہ عام لوگ جو نہ فصاحت وبلاغت کا درک رکھتے تھے اور نہ اس کی قدر کرتے تھے، وہ تو مسلمان ہوتے گئے اور مصیبتیں جھیلیں لیکن لبید نے انتہائی درجے کی بے اعتنائی دکھائی۔ لبید کا شمار ان دشمنان اسلام میں ہوتا ہے جو مخلص اور جاں باز مسلمانوں کو اذیتیں پہنچاتے رہے لیکن غلبۂ اسلام کے بعد تیور فلک پہچان کر مسلمان ہوگئے۔ لبید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو مولفتہ القلوب کہتے ہیں، یعنی جن کے دل انعام واکرام کی لالچ سے اسلام کی طرف مائل ہوگئے۔ كان لبيد و عقلته بن علاثته العامرين المولفته قلوبهم۔(خزانتہ الادب، شیخ عبدالقادری، جلد اول، صفحہ 337)

حسان بن ثابت

میں اس شاعر کے حالات زندگی کے متعلق بھی اپنی گذشتہ کتاب "قرآن اور اس کے مصنفین" میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ پیغمبر اسلام کے درباری شاعر تھے۔ حسان بن ثابت مدینہ میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق قبیلہ بنو خزرج سے تھا۔ محمد کی وفات کے بعد حسان نے اسلام کی تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے مشرقی چین کی جانب سفر کیا۔ اس سفر میں ان کے ہم سفر سعد بن ابی وقاص، ثابت بن قیس اور اویس قرنی شامل تھے۔ مسلم مورخین کے مطابق حسان بن ثابت نے 120 سال کی عمر پائی، یعنی بغیر اسلام کے ساٹھ سال اور اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ساٹھ سال زندہ رہے۔

"سیرت رسول اللہ" کے معروف انگریزی مترجم Prof. Alfred Guillaume کا کہنا ہے، "حسان بن ثابت مہاجرین کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں یہ خانہ بدوش مسلمان اسلام کے لیے مضر ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نہ تو کسی مہاجر کو اپنے گھر میں پناہ دی اور نہ ہی ان میں سے کسی کو اپنا بھائی بنایا۔"

حسان پرلے درجے کے بزدل شخص تھے، انھوں نے کبھی بھی کسی غزوہ یا جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ یہ بھی لبید بن ربیعہ کی طرح موقع پرستی کے شکار تھے اور کوئی جائے فرار نہ دیکھ کر غلبہ اسلام کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ خود علما کی جانب سے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ لبید کی طرح حسان نے کبھی اعجاز فصاحت قرآن پر کوئی گواہی دی ہو۔

عباس بن مرواس

اس کے قبول اسلام کے متعلق سیرت ابن ہشام میں یہ قصہ درج ہے:

عباس کا باپ مرواس ایک پتھر کے بت جس کا نام اس نے ضمار رکھا تھا، پرستش کیا کرتا تھا۔ جب مرواس مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹے عباس سے کہا کہ اے فرزند، تم اسی بت کی پرستش کرنا، یہی تمھارے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ چنانچہ عباس اس بت کی پرستش کیا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے بت کے اندر سے یہ اشعار سنے:

کل للقبائل من علیم کلھم

اودی ضمار عاش اھل المسجد

ان الذی ورث النبوۃ والھدیٰ

لمعبد ابن من قریش مھتدی

اودی ضمار کان یعمد مرۃً

قبل الکتاب الی النبی محمد

جب ابن مرواس نے یہ اشعار سنے، اسی وقت اس بت کو آگ میں جلا دیا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوا۔ (سیرت ابن ہشام، جلد سوم، صفحہ 155)

واضح رہے کہ یوم بدر کے موقع پر یہ شخص کفار کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف رجز خوانی اور ہجو کیا کرتا تھا، لیکن غلبۂ اسلام کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا شمار بھی "مونفہ

القلوب''میں کیا گیا یعنی جن لوگوں کے ایمان کو مال و دولت میں حصہ دے کر پختہ کیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا ایک جدا گروہ تھا۔ لہٰذا طائف کی لوٹ کا استعمال جن لوگوں کے تالیف قلوب کے لیے کیا گیا، ان میں عباس بن مرواس بھی شامل ہے (تاریخ ابوالفدا)۔

ابن اسحاق کہتے ہیں اور عباس مرواس کو حضور نے چند اونٹ عنایت کیے......اس نے ناراض ہو کر چند اشعار کہے جن میں انعام کے قلیل ہونے کا بیان کیا ہے۔ حضور نے صحابہ سے فرمایا، اس کو لے جا کر میری جانب سے اس کی زبان کاٹ دو۔ چنانچہ صحابہ نے لے جا کر اس کو اتنا مال دیا کہ یہ خوش ہو گیا اور یہی اس کی زبان کا کٹنا تھا۔ (سیرت ابن ہشام، جلد سوم، صفحہ 175)

لہٰذا، عباس نہ قرآن پڑھ کر مسلمان ہوئے اور نہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا اعجاز دریافت کر کے اسلام قبول کیا بلکہ اپنے باپ کے بت ضمار کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مسلمان ہوئے جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ یعنی قرآن کی کسی آیت نے انھیں مسلمان نہیں بنایا بلکہ ایک بت کے شعر نے اسے اسلام کی طرف راغب کیا، اور وہ بھی ایسے وقت پر، جب اسلام کی تلوار سر پر بجلی کی طرح کوندرہی تھی اور کوئی جائے اماں باقی نہ بچی تھی۔ لیکن ایسے شخص کی مسلمانی پر بھلا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے جس کے ایمان کو مال دے دے کر مضبوط کیا جاتا رہا ہو۔ ایسے شخص کی حلفی شہادت تک قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔

نابغہ جعدی

اس شاعر کے متعلق بھی یہ کہنا کہ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت پر ایمان لا یا تھا، محض لغو بیانی ہے۔ یہ بات تو خیر مصدقہ ہے کہ نابغہ جعدی ان کمیاب لوگوں میں شامل نہیں تھا جنھوں نے مکی دور میں اسلام قبول کیا تھا یعنی اس وقت جب کہ ایمان لانا پوری آزادی کے ساتھ اور بغیر جبر و اکراہ اور حرص و طمع کے ممکن تھا، بلکہ وہ اس زمانے میں مسلمان ہوا جب اسلام غلبہ پا چکا تھا۔ ''اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ'' سے واضح ہے کہ یہ شخص سنتہ الفود یعنی 9 ہجری میں مسلمان ہوا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ کسی بت پرست کا اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اور تھوڑی سی فہم و دانائی کا استعمال کر کے اسلام قبول کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مسلمان خود بھی قبول کرتے ہیں

کہ ظہور اسلام سے پہلے سینکڑوں اہل عرب بت پرستی ترک کر کے ''دین حنیف'' قبول کر چکے تھے جو بعد میں ''اسلام'' کے نام سے جلوہ گر ہوا۔ زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، ابو ذر غفاری اور سلمان فارسی وغیرہ کے بارے میں تو مسلم مورخین اور سیرت نگاروں کا یہی کہنا ہے کہ وہ اسلام کی بعثت سے قبل مومن تھے، شیطان کے تابع نہ تھے اور بت پرستی کو عقلاً وہ برا سمجھتے تھے۔ نابغہ جعدی بھی انھی لوگوں میں سے تھا جسے اسلام قبول کرنے کے لیے کسی معجزۂ فصاحت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یوں بھی وہ خود فصاحت میں ایسے کئی معجزے دکھا چکا تھا، چنانچہ اس کا نام کی تبدیلی کے ساتھ اپنا اصل دین (دین حنیف) اختیار کیے رہنا، اور وہ بھی اس وقت جب اسلام کی سیاسی قوت اپنے عروج پر تھی، قرین مصلحت تھا۔

''اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ'' میں نابغہ جعدی کے حالات کے بارے میں لکھا ہے:

> وہ جاہلیت میں دین ابراہیم اور حنیفیت کی تلقین کرتا تھا، روزہ رکھتا تھا، استغفار کرتا تھا اور اس نے ایک قصیدہ بھی لکھا جس کا نام شروع اس شعر سے ہوتا ہے کہ؛ شکر ہے اس اللہ کا جس کا کوئی شریک نہیں اور جو شخص اس حقیقت کا قائل نہ ہوا، اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اس قصیدہ میں طرح طرح کے دلائل توحید بیان ہوئے ہیں، قیامت کا اقرار ہے اور اجزائے اعمال کا اور بہشت ودوزخ کا۔

''کتاب الاغانی'' میں اس پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ ''نابغہ جعدی ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے زمانۂ جاہلیت میں امور دین پر فکر کیا تھا، جنھوں نے شراب اور نشہ کو ترک کیا تھا اور ہر اس شے کو جو عقل کو زائل کرتی ہے اور جنھوں نے قمار کے تیروں کو اور بتوں کو چھوڑ دیا تھا۔'' اب آپ ہی ایمان داری سے بتائیں کہ ایسے کسی شخص کے لیے دین محمدی اختیار کر لینا اور مسلمان کہلانا سوائے اس کے کہ کون سی بڑی بات تھی کہ اس نے صرف اپنا نام بدل ڈالا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نابغہ جعدی نے قرآن کو فصیح تسلیم کیا اور اس کی اعجازی فصاحت کا قبول کیا، انھیں چاہیے کہ وہ اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے نابغہ کا کوئی ایسا قول بطور حوالہ پیش کریں جو بلا جبر و اکراہ بھی ہو۔ اس کے برخلاف میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ نابغہ نے قرآن کو صرف ہادی تسلیم کر لینے پر اکتفا کیا، نہ تو اسے فصیح مانا اور نہ معجزہ۔ جب وہ مسلمان ہو کر محمد کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے جو قصیدہ سنایا، اس کے پہلے شعر کا ترجمہ کچھ یوں تھا:

میں رسول اللہ کے پاس آیا جب وہ ہدایت لے کر آیا، اور ایک کتاب پڑھتا ہے جو کہکشاں کی طرح نورانی ہے۔(کتاب الاغانی)

کسی کتاب کو نورانی کہنا اس کو الہامی ماننا ہے۔ قرآن میں تمام الہامی کتابوں کو ''الکتاب المنیر'' کہا گیا ہے (سورہ فاطر)۔ لہٰذا کتاب المنیر کے لیے اعجازی فصاحت لازمی نہیں۔

کعب بن مالک

علما اسے شاعر بے بدل قرار دیتے ہیں۔ کعب بن مالک کا تعلق مدینہ کے قبیلہ خزرج کے انصار سے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص غلبۂ اسلام کے قبل مسلمان ہوا۔ ایسے وقت میں جب کہ ہجرت کی تیاریاں ہو رہی تھیں، اس کا اسلام قبول کرنا خالص نیک نیتی پر محمول معلوم ہوتا ہے۔ حالاں کہ بعد میں اس کا جوش سرد پڑ گیا تھا۔ جب محمد غزوۂ تبوک پر گئے اور مسلمانوں کو اپنے ہمراہ چلنے کہا تو منافقین مدینہ نے جو بظاہر مصلحت وقت کے تحت مسلمان ہو گئے تھے، ان کا ساتھ نہ دیا۔ انھی منافقین نے تین مزید لوگوں کو بہکا کر اپنا ہمنوا بھی بنا لیا تھا، جن میں ایک کعب بن مالک بھی شامل تھا۔ جب محمد غزوۂ تبوک سے لوٹے تو وہ عتاب بن کر کعب بن مالک پر ٹوٹ پڑے، کیوں کہ اس شخص نے غزوۂ بدر میں بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ محمد نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اس سے کوئی بات نہ کرے۔ جب وہ نماز کے لیے آتے تو محمد اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیتے، حتّٰی کہ ان کے سلام کا جواب تک نہ دیتے۔ یہ حالت پورے پچاس دنوں تک جاری رہی اور بعد میں انھیں معاف کر دیا گیا۔ (سیرت ابن ہشام) سورۂ توبہ: 118 میں اسی کعب بن مالک کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ:

> اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب انھیں زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دو بھر ہو گئیں۔ اور انھوں نے جان لیا کہ خدا سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں۔ پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔ بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

لہٰذا، ایسا شخص جو شاعر تو تھا مگر شعرائے عصر میں بھی کوئی سربرآوردہ شاعر نہ تھا اور صرف اس لیے مشہور ہوا چونکہ وہ محمد کی طرف سے کفار کی ہجو کیا کرتا تھا لیکن بیک وقت جو منافقین کا ساتھ بھی دے دیتا تھا اور نتیجتاً معتوب بھی ہو چکا ہو، ایسے شخص کی قرآن اور اسلام پر شہادت کوئی مضبوط شہادت نہیں ہو سکتی۔

کعب بن زہیر

کعب دو بھائی تھے، کعب اور بجیر ان کے باپ زہیر جاہلیت کے مشاہیر شعراء میں تھے، اس لیے شاعری ان دونوں کو وراثت ملی تھی۔

ظہور اسلام کے بعد محمد کا شہرہ سن کر دونوں کو آپ سے ملنے اور آپ کی باتیں سننے کی خواہش ہوئی؛ چنانچہ دونوں بھائی ملنے کے لیے چلے، مقام ابرق العراف پہنچ کر بجیر نے کعب سے کہا تم بکریاں لیے ہوئے یہیں ٹھہرے رہو، میں اس شخص کے پاس جا کر سنوں کیا کہتا ہے؟

چنانچہ کعب کو چھوڑ کر خود محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے اسلام پیش کیا، اسی وقت مشرف باسلام ہو گئے، کعب کو ان کے اسلام کی خبر ہوئی تو انہوں نے جوشِ انتقام میں محمد اور ابو بکر کی شان میں گستاخانہ اشعار کہہ ڈالے، محمد نے یہ اشعار سنے تو آپ کو بڑی تکلیف پہنچی اور آپ نے اعلان کر دیا کہ کعب جہاں ملے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

بجیر اس اعلان سے بہت گھبرائے اور کعب کو لکھ بھیجا کہ رسول اللہ نے تمھارا خون ہدر کر دیا ہے، اب تمھارے بچنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ تم اسلام قبول کر لو، رسول اللہ کی خدمت میں جو شخص بھی آ کر لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیتا ہے تو آپ اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں، اس لیے میرا خط پاتے ہیں تم بلاتاخیر مشرف بہ اسلام ہو جاؤ۔ کعب کو بھی اس کے سوا بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، لہٰذا وہ خط پاتے ہی سیدھے مدینہ پہنچے اور مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ اس وقت محمد اپنے صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما ان سے گفتگو فرما رہے تھے۔ کعب نے آپ کو دیکھا نہ تھا، قیاس و قرینہ سے پہچان کر آپ کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور اشھد ان لا الہ الا اللہ و انك رسول اللہ کہہ کر امان کے طالب ہوئے۔ محمد نے پوچھا، تم کون ہو؟ عرض کیا، کعب بن زہیر۔ فرمایا، تم ہی نے وہ اشعار کہے تھے، پھر ابو بکر سے استفسار فرمایا، ابو بکر نے سنایا:

سقاك أبوبكر بكأس روية
وأنهلك المامور منها وعلكا

(تم کو ابو بکر نے ایک لبریز پیالہ پلایا اور اس میں سب سے زیادہ لبریز پیالہ سے بار بار سیراب کیا)

کعب نے کہا؛ یا رسول اللہ میں نے اس طرح نہیں کہا تھا۔ فرمایا؛ پھر کس طرح؟ انھوں نے ''مامور'' کے لفظ کو ''مامون'' کے لفظ سے بدل کر سنا دیا۔ آپ نے کعب کی گذشتہ خطاؤں سے درگذر فرمایا اور ارشاد ہوا، تم مامون ہو، پھر کعب نے اپنا مشہور و معروف قصیدہ بانت سعاد سنایا، جو

اسی وقت کے لیے کہہ کر لائے تھے۔اس حسن تلافی سے کعب نے رضائے نبوی اور شہرتِ دوام کا خلعت حاصل کیا، محمد نے خوش ہو کر ردائے مبارک عطا فرمائی۔(سیرت ابن ہشام، اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ)

عبداللہ بن الزبعری

انھی شعرا میں ایک نام عبداللہ بن الزبعری کا بھی تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: انکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم (تم اور تمھارے معبود باطل جہنم کے ایندھن ہیں: سورہ انبیا 98) تو اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ ابن الزبعری نے محمد سے بحث و مجادلہ کیا۔ ابن الزبعری نے محمد سے کہا کہ میں آپ سے بحث و حجت میں جیت گیا، قسم ہے رب کعبہ کی! بھلا دیکھو تو نصاریٰ مسیح کو اور یہود عزیز کو پوجتے ہیں، اور اسی طرح بنی ملیح فرشتوں کو، سو اگر یہ لوگ جہنم میں ہیں تو چلو ہم بھی راضی ہیں کہ ہمارے معبود بھی ان کے ساتھ رہیں۔ کفار فجار اس پر بہت ہنسے اور قہقہے لگانے لگے۔ اس برجستہ و معقول گرفت پر محمد سٹپٹا گئے۔ انھوں نے فوراً جبرئیل کو آواز دی اور اپنی غلطی کی کچھ یوں تصحیح فرمائی: ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئك عنھا مبعدون (بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی ٹھہر چکی ہے، وہ سب جہنم سے دور ہی رکھے جائیں گے: سورہ انبیا 101)

لیکن یہی ابن الزبعری غلبۂ اسلام کے بعد بھاگتا ہوا محمد اور اسلام کی مدح میں قصیدہ سناتا ہوا مسلمان ہو گیا۔ قصہ مختصر، مکی دور جو 13 برسوں پر محیط تھا، اس میں مسلمان ہونے والوں کی فہرست میں کافی تلاش کرنے کے بعد بھی مجھے عرب کے فصحا و بلغا کا ایک نام نہیں ملتا۔ لہٰذا، اب میری علمائے اسلام سے درخواست ہے کہ وہ ثابت کریں کہ قبل غلبۂ اسلام وہ کون سا فصیح تھا جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا معترف ہوا ہو؟ کعب بن زہیر جیسا شاعر نکتہ سنج جس کی فصاحت کا کوئی بدذوق ہی منکر ہو سکتا ہے، وہ اس وقت تک اپنے انکار اور تکذیب پر اڑا رہا جب تک اس کا خون ہدر نہیں کر دیا گیا۔ ولید بن مغیرہ جیسا شاعر محقق جو مرتے مر گیا لیکن مسلمان نہ ہوا اور ہمیشہ قرآن کی ہجو کرتا رہا۔ اس نے اپنے سامنے کبھی بھی قرآن کی دال گلنے نہیں دی۔ ممکن ہے کہ اگر یہ فتح مکہ کے وقت زندہ رہتا تو اس کا بھی خون ہدر کر دیا جاتا اور شاید یہ بھی کعب بن زہیر یا عبداللہ بن زبعری کی طرح اپنی جان بچانے کی خاطر اسلام قبول کر لیتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ جن فصحا و بلغا کی مثالیں دی جاتی ہیں کہ انھوں نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کی تصدیق کی، محض لغو بیانی ہے۔ان میں سے کسی نے تیور زمانہ پہچان کر اسلام قبول کیا، کسی نے اپنے سر پر لٹکتی تلوار اور کوئی جائے اماں نہ دیکھ کر تو کسی نے مال و دولت کے حرص میں قرآن کو سجدہ کیا، حتیٰ کہ عباس بن مرواس نے تو اپنے باپ کے بت کی گواہی پر اسلام قبول کیا، گویا ''میں مسلماں بھی ہوا ایک بت پہ ایماں لا کر۔''

قرآن کی فصاحت پر متاخرین کی رائے

قرآن کے متعلق اعجاز فصاحت کے جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں، وہ محض قیاسات پر مبنی ہیں، جس میں غلط بیانی ہے، خوش اعتقادی ہے، مبالغہ ہے، تعلی ہے، تقلید ہے۔ جتنی بھی تعریفیں ممکن ہو سکتی تھیں، وہ قرآن سے چسپاں کر دی گئیں، بالکل اسی طرح جیسے جود و سخا کی تمام روایتیں حاتم طائی کے سر تھوپ دی گئیں یا تمام دانائی کے اقوال حضرت سلیمان کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔

قرآن کی فصاحت کے تعلق سے عجیب عجیب منقول روایات کا سلسلہ کتابوں میں موجود ہے۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ ایک اعرابی نے جوں ہی قرآن کی آیت سنی، وہ سجدے میں گر پڑا اور کہنے لگا کہ سجدہ کرتا ہوں میں اس آیت کی فصاحت کو، کیوں کہ اس کی فصاحت ایسی عظیم ہے کہ لائق سجدہ ہے۔ اس طرح کی روایات میلاد شریف یا جمعہ کے خطبے میں کافی کام آتی ہیں، کیوں کہ وہاں ان کی سند مانگنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

بلاشبہ دنیا میں ایسے کلام موجود رہے ہیں جنھیں بڑے بڑے نقادان سخن نے سجدہ کیا ہے اور جن کے سجدے کی روایات کی سند بھی موجود ہے۔ مثلاً ''کتاب الاغانی'' میں راویوں کے نام و سلسلہ کے ساتھ مرقوم ہے کہ جب لبید کا ایک شعر پڑھا گیا تو فرزدق جو وہاں موجود تھا، سنتے ہی سجدے میں گر پڑا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تو نے سجدہ کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ جس طرح تمھیں معلوم ہے کہ قرآن میں سجدہ کہاں کرنا چاہیے، اسی طرح مجھے پتہ ہے کہ شعر میں کہاں سجدہ واجب ہے۔

واضح رہے کہ یہ کسی اعرابی کا سجدہ نہیں بلکہ فرزدق کا سجدہ تھا جو خود اپنے زمانے میں مسجود شعرا رہ چکا ہے۔ یہ واقعہ تاریخ کے صفحات میں درج ہے۔ اب کوئی مجھے قرآن کی کسی آیت پر کسی ایسی گواہی کے بارے میں سنائے کہ فرزدق کے پایہ کے کسی نقاد سخن نے سجدہ کیا ہو اور وہ قبل زمانۂ غلبۂ اسلام بھی رہا ہو۔ عرب میں کسی سخن کی فصاحت کو سجدہ کر کے اس کی داد دینا ایک معمولی بات تھی، لیکن ہم تک آیات قرانیہ پر کسی سجدے کی سچی روایت نہیں پہنچی بلکہ اس کے برعکس قرآن حاسدانہ جذبے کے تحت اس کی شکایت کرتا نظر آتا ہے: ''واذا قری علیھم القرآن لا یسجدون۔

بل الذین کفروایکذبون۔ ‘‘[اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔ بلکہ کافر جھٹلاتے ہیں۔](سورہ الانشقاق:21-22)

فرقۂ معتزلہ نے عقلی دلائل سے معجزۂ فصاحت کا انکار کیا۔ ان انکار کرنے والوں میں ایسے نام شامل ہیں جو اپنے زمانہ میں علم و ادب کے حوالے سے مشاہیر میں شمار ہوتے تھے۔ شہرستانی کی ’’الملل و النحل‘‘ (جلد اول) میں معتزلہ کے ایک عالم ابو موسیٰ مرذار کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اعجاز قرآن کے منکر تھے۔ ان کے مطابق ’’انسان فصاحت و نظم و بلاغت کے لحاظ سے قرآن کے مثل بنانے پر قادر ہے۔‘‘ (صفحہ 37)

ابراہیم بن سیار نظام سے اہل علم خوب واقف ہوں گے۔ یہ شخص دوسری صدی ہجری (775-845) میں گذرا ہے جو معروف معتزلی عالم دین ابوالھذیل علاف کا بھانجا تھا۔ نظام کو اپنے زمانے کا استاد یگانہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی طبیعت کو علم و ادب کے ساتھ خاص مناسبت تھی۔ اکتساب علم کے لیے اس کا پورا دارومدار اس کے حیرت انگیز حافظہ پر تھا۔ تمام علوم کی کتابیں اس کی نوک زبان پر تھیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن کے علاوہ اسے توریت، انجیل اور زبور بھی مع تفسیر از بر تھے۔ نظام خود ایک نازک خیال شاعر تھا اور اسے شعرائے عرب کا کلام بھی حفظ تھا۔ یہ شخص اعتزال میں ایک نئے فرقے کا بانی ہوا جس کا نام نظامیہ تھا۔ اس فرقے کے عقیدے کے مطابق قرآن کی فصاحت و بلاغت معجزہ نہیں بلکہ اس میں غیب کی خبریں معجزہ ہیں۔ نظام کے قول کے مطابق؛ ’’اہل عرب کو جبراً عاجز کیا گیا تھا اور روکا گیا تھا ورنہ اگر آزادی بخشی جاتی تو وہ اس بات پر قادر ہوتے کہ بلاغت و فصاحت و نظم کے اعتبار سے قرآن کی مثل کوئی سورۃ بنالاتے۔‘‘ (تہذیب الاخلاق، مشاہیر معتزلہ، 1313 ہجری)

اسی طرح اور بھی نظیریں ہیں کہ بڑے بڑے ادیب جن کی عربی دانی مسلم تھی اور باوجود مسلمان ہونے کے انھوں نے قرآن کے اعجاز فصاحت سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ واثق دلائل سے انکار کیا۔ شیخ ابوالحسن اشعری، شریف مرتضیٰ علم الھدی وغیرہ کا یہی موقف ہے کہ قرآن اعجاز فصاحت کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ بن صبیح نے تو یہاں تک کہہ دیا، ’’فصاحت و بلاغت میں قرآن سے معارضہ ممکن ہے۔‘‘

متنبی (915-965) کے نام سے کون واقف نہیں۔ اگرچہ وہ کوفہ میں پیدا ہوا لیکن قبائل عرب کے درمیان پرورش پائی اور ان میں شیر و شکر ہو کر نہ صرف اہل زبان میں شمار ہوا بلکہ اہل

زبان کا استاد بن گیا۔ وہ لغت عرب کا ایسا ماہر تھا کہ ہر بات پر کلام عرب کی سند لاتا تھا۔ دنیائے اسلام میں متنبی سے بڑا عربی داں پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کو لوگوں نے ابو تمام جامع حماسہ (788-845) پر بھی فوقیت دی (ابن خلکان)۔ فصاحت و بلاغت پر اسے اتنا بڑا غرہ تھا کہ محض زبان دانی کے بل پر اہل زبان کے آگے اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے کلام کو معجزہ قرار دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے دعوے کو لوگوں نے مان بھی لیا (ابن خلکان)۔ متنبی کے مریدوں میں ایک شخص ابو عبداللہ معاذ بن اسمٰعیل الادقی گذرا ہے جو اس کے نبوت کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے؛

320 ہجری میں ابو طیب متنبی ادقیہ آئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر داڑھی نہ تھی۔ ان کی کاکلیں کانوں کی لو تک پڑی تھیں۔ پس میں نے ان کی تعظیم و تکریم کی جب کہ میں نے ان کی فصاحت و وجاہت دیکھی۔ پھر جب میرے اور ان کے درمیان محبت بڑھ گئی، میں ان کی صحبت کو غنیمت سمجھنے لگا اور ان کے ادب سے فائدہ اٹھانے لگا۔ ان کے ساتھ مجھ کو تنہائی کا اتفاق ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ خدا کی قسم آپ ایک خوب صورت جوان ہیں اور کسی بڑے بادشاہ کی مصاحبت کے سزاوار۔ یہ سن کر انھوں نے کہا، 'تجھ پر حیف، تو کیا کہہ گیا، میں تو نبی فرستادہ ہوں۔' میں نے خیال کیا کہ شاید وہ ہنسی کرتے ہیں۔ پھر غور کیا کہ میں نے ان کے منھ سے کبھی کوئی بیہودہ بات نہیں سنی۔

یہی راوی ایک دوسرے موقع کے تعلق سے کہتا ہے؛

میں نے ان سے پھر کہا کہ آپ نے کہا تھا کہ میں نبی فرستادہ ہوں امت کی طرف۔ پس کیا آپ پر کوئی وحی اتری؟ وہ بولے 'ہاں'۔ پس میں نے کہا کہ جو وحی آپ پر اتری، اس میں سے کچھ مجھے سنائیے۔ انھوں نے مجھ کو کچھ ایسا کلام سنایا جس سے پاکیزہ کوئی کلام میرے کان میں نہیں پڑا تھا۔ میں نے پوچھا اس قسم کی کتنی وحی ہیں جو آپ پر اتریں؟ انھوں نے جواب دیا کہ 'ایک سو چودہ عبرہ۔' میں نے پوچھا کہ عبرہ کا اندازہ کیا ہے؟ انھوں نے ایک مقدار سنایا جو قرآن کی آیتوں میں سب سے بڑا تھا۔ میں نے پوچھا کتنی مدت میں نازل ہوا؟ کہا، 'کل ایک دفعہ میں'۔

پھر یہی راوی ایک اور قصہ بیان کرتا ہے کہ متنبی سے ایک کرامت ظاہر ہوئی جسے دیکھ کر میں اس کی نبوت کا قائل ہو گیا۔

میں نے اس کو سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے کہا آپ اپنا ہاتھ پھیلائیے۔

میں گواہی دیتاہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پس انھوں نے ہاتھ پھیلایا اور میں نے بیعت کی اور میں نے اپنے خاندان کی طرف سے بھی بیعت کی۔ پھر اس کے بعد خبر ملی کہ ملک شام کے تمام شہروں میں اس کی بیعت عام ہوگئی۔

اس کے بعد لکھاہے کہ "ابن علی ہاشمی نے اس کو گرفتار کیا اور قید مشقت دے کر آخر کار اس سے توبہ کرائی۔" (تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن)

بلاشبہ متنبی عربی زبان کا ایک کامل استاد اور ادب میں امام فن ہو کر گذرا ہے جس کے کلام کے مخالفین بھی معترف ہیں۔ یہ شخص قرآن کا قاری بھی تھا اور کبھی اوروں کی طرح مسلمان بھی رہ چکا تھا۔ سوال اٹھتاہے کہ ایسا شخص قرآن کا منکر کیوں کر ہوا اور خود کیوں مدعی نبوت بن کر قرآن کے مقابلے میں 114 عبرہ لکھے، واضح رہے کہ قرآن میں بھی 114 سورتیں ہیں۔ اگرچہ وہ تمام مواد اسلام کے پرچم تلے نابود ہو گیا لیکن متنبی کا نام آج بھی زندہ ہے۔ اس کے دعاوی صفحۂ تاریخ پر نقش ہیں اور بآواز گواہی دیتے ہیں کہ ایسا شخص جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو پرکھنے کی سب سے زیادہ قابلیت رکھتا تھا، اس کا منکر ہو گیا۔ اس کا انکار قطعی شہادت ہے جس کے بارے میں کوئی مسلمان زبان نہیں ہلا سکتا۔ اب جہاں تک متنبی کے توبہ والا معاملہ ہے تو اس کی مثال گیلیلیو سے دی جاسکتی ہے جسے جبر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے اور اپنی اس تحقیق سے توبہ کرنا پڑا تھا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔

متنبی کی طرح ایک اور کامل الفن ابوالعلا المعری (973-1057) بھی گذرا ہے جس کی کتاب "رسالۃ الغفران" کا موازنہ دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" سے کیا جاتا ہے۔ یہ شخص چار سال کی عمر میں نابینا ہو چکا تھا۔ اس نابغۂ روزگار کی معروف کتاب "الفصول و الغایت" کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ یہ قرآن کی پیروڈی ہے اور اس نے محض اس لیے لکھی تا کہ وہ قرآن کے اعجاز فصاحت کو چیلنج کر سکے۔ گویا ایک اندھے نے قرآن کی ہمسری کر کے اس کے معجزے کا بھرم کھول کر رکھ دیا۔

متنبی اور ابوالعلا المعری کی طرح اور بھی سینکڑوں گذرے ہوں گے جنھوں نے قرآن کی اعجازی فصاحت کا انکار اعلانیہ بھی کیا اور خفیہ طور پر بھی کیا، یہ علاحدہ بات ہے کہ اسلامی تاریخ کے کوریئر نے ان کی delivery ہم تک نہیں ہونے دی، محض وہ دو چار لوگ جنھوں نے تاریخ پر اپنا سکہ جما دیا تھا اور جنھیں نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کی جاسکتی تھی، ان کے انکار کی روایت ہم

تک پہنچی۔

المختصر، اعجاز کے لیے لازم ہے کہ وہ بدیہی ہو، تاکہ جب اس پر استدلال کیا جائے تو اس میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ خود مسلمانوں کا اس بارے میں اختلاف اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ دلائل اعجاز مخفی ہیں، لہٰذا انھیں معجزہ کے ثبوت کے طور پر کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں میں سے اکثر یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ جو لوگ زبان عربی سے ناواقف ہیں یا اس میں انھیں کامل مہارت حاصل نہیں ہے اور اس کے فن معانی اور صنائع و بدائع کو کامل طور پر نہیں جانتے، وہ قرآن جیسے بلیغ ترین کلام کی فصاحت وبلاغت کو کسی طرح نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس کے محاسن و لطائف کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ ماہرین فن اور کاملین زبان تھے، انھیں کی شہادت اس مسئلے میں قابل قبول ہوئی، چنانچہ فصاحت کا دارومدار بعض معاصرین کے مفروضے کے اجماع پر قائم ہو گیا، جسے زیادہ سے زیادہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن معجزے کا تصور تاریخ سے ماوریٰ ہے۔ خود مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن ایک معجزۂ مستمرہ ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہنے والا ہے۔ لہٰذا اس دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے اعجاز فصاحت کا ہر عہد میں اثبات ہو سکے اور ہر طبقۂ انسانی پر اتمام حجت ہو۔ لیکن ہر طبقہ انسانی پر اتمام حجت کسی عہد میں بھی ممکن نہیں ہے، حتیٰ کہ عہد نبوی میں بھی محال ہے؛ کیوں کہ چند لوگوں کو چھوڑ کر زبان وادب کی نکتہ سنجیوں سے نابلد تھے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ فصاحت قرآن کو معجزہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ وہ صرف اہل زبان تک محدود ہے اور دوامی معجزہ بلکہ عقلی معجزہ تو اسے بالکل نہیں ٹھہرایا جا سکتا، حتیٰ کہ یہ نقلی معجزہ بھی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک وہم ہے جو لفظ ''کلام الٰہی'' کی غلط تعبیر پر مبنی ہے۔ ایک بار جب اسے اللہ کا کلام مان لیا گیا تو ظاہر ہے اس کا لفظ لفظ آسمانی ہے۔ لفظ لفظ ایک خزانہ ہے جس کے مقابلے میں دونوں جہان ہیچ، عقل ہیچ، فہم ہیچ، فلسفہ ہیچ۔ اس کا لفظ لفظ شفا ہے، اس سے مرض دفع ہوتا ہے، پہاڑ ٹل جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ خلاصہ کلام یہ کہ ایک بار اسے ایمان کی آنکھوں سے دیکھ لیا تو ساری بحث اور سارے دلائل بیکار محض ہیں۔ جمہور اسلام قرآن کے حق میں جو گمان بالیقین رکھتے ہیں، اس کی بنیاد نفس الامر نہیں بلکہ خوش اعتقادی ہے جو ان کی مذہبی دل سوزی سے حاصل ہوئی ہے۔

قرآن کے اسلوبی اور نحوی نقائص

پروفیسر حمید الدین نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں کام کی بات کی ہے؛

علمائے اسلام نے جب یہ ثابت کرنا چاہا کہ قرآن مجید بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ پہلے بلاغت کے اصول و قواعد مرتب کردیے جائیں۔اس کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ خود کلام عرب کا تتبع کیا جاتا اور بلاغت کی جزئیات کا استقصا کرکے اس کے اصول اور ضوابط منضبط کیے جاتے۔ لیکن جس زمانے میں یہ کوشش کی گئی،اس وقت عجم کے علوم وفنون کا اثر مسلمانوں پر غالب آگیا تھا۔اس لیے مسلمانوں نے جس طرح دوسرے علوم وفنون یونان اور فارس سے اخذ کیے،اس فن کے مسائل بھی انھیں کی تحقیقات کے موافق مرتب کیے۔ عجم کے نزدیک بلاغت کے اصل ارکان؛ تشبیہ اور بدیع ہیں، چنانچہ علمائے اسلام نے بھی انھیں چیزوں کو مہتم بالشان قرار دے دیا، حالاں کہ اہل عرب کے نزدیک بدیع ایک لغو چیز ہے اور تشبیہ چنداں قابل اعتنا نہیں۔ (ماہنامہ الندوہ، دسمبر 1905)

ہمارے بیشتر علمائے کرام نے قرآن کی نحوی اور اسلوبی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے چالاکی یہ کی کہ مکمل عربی زبان کو قرآن کے تابع کردیا اور اس کے بلاغت وفصاحت کے اصول و قواعد کو ازروئے قرآن مرتب کردیا۔اس سے یہ ہوا کہ قرآن کا نقص کلام حسن کلام بن گیا اور اس کی ایسی ایسی تاویلیں گڑھی گئیں کہ پورا مصحف اہل ایمان کے لیے زبان وبیان کا جیتا جاگتا شاہکار بن گیا۔ آئندہ دو باب میں ہم قرآن کی نحوی اور اسلوبی غلطیوں کو نشان زد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ قرآن معائب سخن سے پُر کلام ہے جس کی توجیہ خواہ جتنی بھی کی جائے، وہ بہر حال اعجاز کے مرتبہ پر فائز نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ ایسی غلطیاں ہر انسانی کلام میں ممکن اور موجود ہو سکتی ہیں لیکن ہم کم از کم اس ذات باریٔ تعالیٰ سے اس کی توقع ہر گز نہیں رکھ سکتے جو منبع علم اور مصدر فصاحت وبلاغت ہے۔

اس سے قبل کہ ہم فصاحت وبلاغت کے معیار پر قرآن کو پرکھیں، ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم

یہ جان لیں کہ فصاحت و بلاغت سے حکما یا ماہرین کی کیا مراد ہے اور وہ کون سے معائب ہیں، جو کسی عبارت یا شعر کو مرتبۂ فصاحت و بلاغت سے نیچے گرا دیتے ہیں۔

فصاحت کیا ہے؟

از روئے لغت فصاحت کے لغوی معنی خوش بیانی اور خوش کلامی ہیں۔ علم معانی میں اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ ہونا جنھیں اہل زبان بولتے ہوں اور جس میں انوکھی ترکیبیں، ثقیل بھدے، غیر مانوس، مغلق، خلاف محاورہ الفاظ و مرکبات نہ ہوں۔

فصاحت کے ساتھ موصوف ہوتا ہے؛ لفظ مفرد، کلام اور متکلم۔ فصاحت فی المفرد کے معنی یہ ہیں کہ لفظ مفرد تنافر حروف، غرابت اور مخالفت قیاس لغوی سے خالی ہو۔ اگر کسی کلام میں ان تینوں معائب میں سے کوئی ایک بھی عیب موجود ہو گا تو وہ فصیح نہ ہو گا۔

تنافر الحروف کے معنی یہ ہیں کہ لفظ زبان پر بھاری معلوم ہو اور بدقت تمام بولا جائے۔ غرابت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ وحشی اور اس کے معنی ظاہر نہ ہوں اور مستعمل بھی نہ ہو۔ مخالفت قیاس لغوی سے یہ مراد ہے کہ لغات عرب کی تحقیقات کے بعد جو قوانین وضع کیے گئے ہیں، ان کے خلاف کوئی لفظ نہ بولا جائے۔ بعض ماہرین کے مطابق فصاحت فی المفرد میں ان تینوں شرائط کا پاس ضروری ہے، علاوہ ازیں وہ لفظ سماعت پر گراں بھی نہ گذرے۔

کلام فصیح اسے کہتے ہیں جس میں ضعف تالیف، تنافر الحروف اور تعقید نہ ہو۔ ضعف تالیف کے معنی یہ ہیں کہ کلام کے اجزا قواعد نحویہ کے بر خلاف ترکیب پائیں۔ تنافر کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی یہ ہے کہ کلام زبان پر بھاری محسوس ہوں۔ تعقید کے یہ معنی ہیں کہ عبارت ترتیبی خلل کے سبب اپنے معنی پر واضح دلالت نہ کرے۔ ترتیب میں خلل اس وقت واقع ہوتا ہے جب لفظوں کی ترتیب معنوں کی ترکیب پر نہ ہو، کسی لفظ کے تقدم یا تاخر کے سبب یا اضمار کا ذکر قبل کرکے، یا عبارت کی ترتیب ایسی ہے کہ قاری کا ذہن مرادی معنی کی جانب فوراً رجوع نہیں کر پاتا، کیوں کہ لغوی معنی کچھ اور ہے جب کہ متکلم کا مرادی معنی مختلف ہے جو خفی ہے، لٰہذا یہ تعقید ہے۔

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ فصاحت کلام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کا ایک بار ذکر ہو چکا، اس کا متعدد بار ذکر نہ کیا جائے۔

فصاحت فی المتکلم کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ایسی قوت ہو جس کے سبب وہ اپنا مطلب

فصیح الفاظ میں ادا کر سکے۔

بلاغت کیا ہے؟

از روئے لغت بلاغت کے معنی مرتبہ کمال اور انتہائے کمال کو پہنچنا، نیز مقتضائے حال کے موافق بولنا ہے۔ گویا کلام بلیغ وہ ہے جو فصاحت کے ساتھ ساتھ موافق مقام کے بھی بولا جائے، چونکہ موقع و محل مختلف ہوتے ہیں، اس لیے کلام کے مقام بھی مختلف ہیں۔

بلاغت فی المتکلم یہ ہے کہ بولنے والے میں ایسی قوت ہو کہ وہ کلام بلیغ بول سکے۔ مثلاً کئی مقام پر قرآن اور پیغمبر اسلام نے مقتضائے مقام کے خلاف جواب دیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

یہ تو تھا فصاحت اور بلاغت کا مختصر ترین بنیادی تعارف، ورنہ ان پر ماہرین نے ہزاروں صفحات سیاہ کر رکھے ہیں جنھیں یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہے۔ اب جب کہ فصاحت و بلاغت کی متفقہ علیہ تعریف اور معیار ہمارے سامنے ہیں تو پھر ہمیں قرآن کو اس پر پرکھنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

قرآن کی بے ربطی:

قرآن کے جو سب سے بڑے عقیدت مند ہیں، انھیں بھی قرآن کی بے ربطی پر یہ کہنا پڑا کہ:

اگرچہ قرآن من جانب اللہ نازل ہوا لیکن اس کے اجزا میں بہت کم تناسب ہے۔ عبارت تو اس کی حیرت انگیز ہے لیکن سلسلۂ مضامین اور دلائل منطقی اس میں اکثر مفقود ہیں۔ (علامہ بلگرامی، "تمدن عرب"، صفحہ 109)

کچھ لوگوں نے بڑے درد سے اعتراف کیا کہ:

یہ امر صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید کی اکثر آیات میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہے۔ ایک میں کسی فقہی حکم کا بیان ہے، اس کے بعد کوئی اخلاقی بات شروع ہو جاتی ہے، پھر کوئی قصہ چھڑ جاتا ہے، ساتھ ہی کافروں سے خطاب شروع ہو جاتا ہے، پھر کوئی اور بات نکل آتی ہے۔ غرض یہ کہ عام تصنیفات کا جو طرز ہے کہ ایک قسم کے مطالب یکجا بیان کیے جائیں، قرآن پاک کا یہ طرز نہیں۔

یہ تحریر کسی ایرے غیرے کی نہیں بلکہ مولانا شبلی نعمانی کی ہے۔ وہ ماہنامہ "الندوہ"، دسمبر

1905 میں اپنے شائع شدہ مضمون میں آگے رقمطراز ہیں؛

بعض علمانے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیتوں میں ابتدا سے لے کر انتہا تک ترتیب اور تناسب ہے۔ بقاعی نے اس کے ثبوت میں مستقل تفسیر لکھی ہے جس کا نام "نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور" رکھا ہے، لیکن اس کے مطلب جو تفسیروں میں نقل کیے ہیں، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی تناسب پیدا کیا ہے، اور اس قسم کا تناسب دنیا کی نہایت مختلف بلکہ متناقض چیزوں میں بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اہمال کی منطق:

اعجاز قرآن کے باب میں علمانے ایسے الفاظ میں سے بھی دریائے بلاغت رواں کردیے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں یعنی مہمل ہیں۔ آپ چاہیں تو میری بات کی تصدیق کے لیے "تفسیر کبیر" کے شروع حصے کا مطالعہ فرمالیں جس میں قرآن کے حروف مقطعات پر بحث ہے۔ حالاں کہ لغت عرب کے اعتبار سے ان حروف کے مجموعہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور یہ بھی ہمیں علم ہے کہ عرب کی زبان میں ان حروف واصوات کے کوئی معنی نہیں، لیکن پھر بھی ضد ہے کہ یہ مہمل نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ان کے معنی کوئی نہیں جانتا۔ اب مجھے نہیں پتہ کہ مہمل کی اور تعریف کیا ہوتی ہے؟

چودہ سو سال سے لوگ ان مہمل حروف کے پتھر سے اپنا سر پھوڑ رہے ہیں۔ کوئی الف میں استقامت دیکھتا ہے، لام میں سر تسلیم خم اور میم میں دائرۂ محبت۔ کوئی ان میں اللہ، جبرئیل اور محمد کو دیکھتا ہے اور کوئی اس میں مدت قیام امت محمدیہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت ہے کہ اس میں کچھ نہیں۔

ہر وہ کلام جس میں "کلمۂ غریب" یعنی "وحشی" ہو، وہ فصاحت سے خالی سمجھا جاتا ہے اور لسان العرب کے مطابق "وحشی" وہ کلمہ ہے جس کے معنی ظاہر نہ ہوں اور نہ وہ استعمال اور بول چال میں ہو۔ حروف مقطعات کا شمار اسی میں ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ کلام الٰہی کو "وحشی" تسلیم کرلینے سے اس کا اعجاز بھی چلا جاتا ہے اور تقدس بھی۔ لہٰذا ہر شخص بقدر استطاعت وایمان اس معمے کو سلجھانے میں لگا ہوا ہے۔ اس کی مثال مثنوی مولوی معنوی سے دی جاسکتی ہے، جو تصوف کا بحر ذخار مانا گیا ہے۔ اس میں سے غواصان بحر نے ایسے ایسے نادر موتی نکالے کہ کیا کہنے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو اس میں تھے، وہ تو تھے ہی لیکن جو نہیں تھے وہ بھی نکال لیے، ان کے بھی کیا کہنے۔ اگر اس کی شروعات بسم اللہ سے نہیں تو یہ بھی ایک نکتہ ہے۔ اگر اس کا دیباچہ حمد و نعت سے خالی ہے تو اس میں بھی گہرا راز ہے۔ لیکن اس بارے میں ہمارے ایک واقف کار نے کچھ ایسے راز کھولے کہ میرے کان کھڑے ہوگئے اور وہ یہ کہ مولانا علیہ رحمتہ نے اپنی مثنوی کو "بشنو" کے نام سے شروع کیا ہے جو برج بسیّا شام کنھیا بنسی بجیّا میں اتر گئے تھے اور رادھا کے فراق میں بانسری سے سوزناک لے نکالا کرتے تھے۔

تکرار

قرآن کے ایک عام قاری کو اس کے مطالعے کے دوران ایک الجھن یہ محسوس ہوتی ہے کہ اسے اس کتاب میں کوئی منطقی ترتیب نظر نہیں آتی۔ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت، تنقید و ملامت، تخویف و تبشیر، دلائل و شواہد، تاریخی قصے اور آثار کائنات وغیرہ کی طرف اشارے بار بار ایک دوسرے کے بعد چلے آ رہے ہیں اور ایک ہی مضمون کو مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کا مصنف لکھتا ہے؛

> اس طرح قرآن اکثر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ کسی قدر الل ٹپ انداز میں مرتب کیا گیا ہے
>
> By a rather haphazard method of composition
>
> اور اس احساس کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ مختلف دل نشین جملے جیسے ولکن اللہ غفور رحیم، ان اللہ علیم حکیم، و لکن اکثر الناس لا یعلمون وغیرہ سیاق و سباق سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں یا بالکل ہی متعلق نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں محض صوتی نغمگی کے لیے مربوط کر دیا گیا ہے۔ (جلد 15، 1977)

تکرار عبارت اور تکرار لفظی کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(1) سورۂ قمر میں "فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ" اور "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْءَانَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ" کی تکرار محض صوتی نغمگی کے لیے ہے نہ کہ اس سے کوئی نئی بات پیدا ہوتی ہے۔

(2) سورۂ مرسلات میں "وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ" کی 15 بار تکرار ہوئی ہے۔

(3) لفظی تکرار کی قرآن میں بہت ساری مثالیں ہیں۔ مثلاً "فَلَوْلَآ إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ۔ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ۔ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ۔ فَلَوْلَآ إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ۔

تَرْجِعُونَهَآ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ۔(سورہ واقعہ:83-87) میں "فَلَوْلَآ" کی تکرار غیر ضروری ہے۔

(4) "ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا۟ ٱلسُّوٓءَ بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ تَابُوا۟ مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوٓا۟ إِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ"(سورہ نحل:119)ایک ہی عبارت میں "إِنَّ رَبَّكَ" کی تکرار اسے اعجاز کے مرتبہ سے گرادیتا ہے۔

(5) "ءَأَمِنتُم مَّن فِى ٱلسَّمَآءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ ٱلْأَرْضَ فَإِذَا هِىَ تَمُورُ أَمْ أَمِنتُم مَّن فِى ٱلسَّمَآءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ"(سورہ ملک 16-17)میں "ءَأَمِنتُم" کی تکرار بھی دیکھ لیں۔

(6) سورہ ملک کی 28اور 30نمبر کی آیات کی "اعجازی تکرار" بھی ملاحظہ کریں: "قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِىَ ٱللَّهُ وَمَن مَّعِىَ أَوْ رَحِمَنَا فَمَن يُجِيرُ ٱلْكَٰفِرِينَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ۔ قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَن يَأْتِيكُم بِمَآءٍ مَّعِينٍۭ۔"

(7) سورہ اعراف کی 97 تا 99نمبر کی ان آیات میں اس تکرار کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ "أَفَأَمِنَ أَهْلُ ٱلْقُرَىٰٓ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَٰتًا وَهُمْ نَآئِمُونَ۔ أَوَأَمِنَ أَهْلُ ٱلْقُرَىٰٓ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ۔ أَفَأَمِنُوا۟ مَكْرَ ٱللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْخَٰسِرُونَ۔

(8) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (سورہ مدثر: 19-20)

(9) فَإِنَّ مَعَ ٱلْعُسْرِ يُسْرًا

إِنَّ مَعَ ٱلْعُسْرِ يُسْرًا (سورہ الشرح:5-6)

یہ کچھ مثالیں تھیں جن میں بے محل تکرار لفظی و تکرار معنوی کا استعمال کیا گیا ہے۔اس کے جواز میں ہمارے علما اکثر عبید بن الابرص الاسدی، عوف بن عطیہ بن خزع الربابی، مہلہل بن ربیعہ، حارث بن عبادہ، حسین بن خطیر معن بن زائدہ وغیرہ جیسے شعرا کے اشعار کی نظیریں پیش کرتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تکرار لفظی ہو یا تکرار معنوی؛ یہ دونوں شاعری کے صنائع ہیں نہ کہ نثر کے۔اب اگر خود اللہ اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ "اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں"(سورہ حاقہ: 41)تو پھر ہم کون ہوتے ہیں اس پر شاعری کے خواص تھوپنے والے؟

کوئی کہتا ہے کہ قرآن "ٹھیٹھ نثر" ہے، کوئی اسے "مسجع ومقفیٰ" بتاتا ہے تو کوئی یہ کہتا ہے کہ اگرچہ قرآن نثر میں ہے میں لیکن اس میں شعری خواص موجود ہیں۔یہ تو ایسے ہوا جیسے کوئی کہے کہ

اگرچہ فلاں شخص مرد ہے لیکن اس میں زنانہ خواص بھی موجود ہیں۔ مجھے ایسی کسی صنف ادب کا پتہ نہیں، البتہ مجھے ''نثری شاعری'' کا علم ضرور ہے لیکن قدیم عربی اصناف ادب میں اس کا اتہ پتہ نہیں ملتا۔ شاعری یا تو شاعری ہو گی یا نہ ہو گی۔ وہ بیک وقت شاعری اور نثر نہیں ہو سکتی۔ وہ خواص جو نثر کے ہیں یعنی بندش کی چستی، برجستگی، سلاست، روانی، ایجاز، زور بیان، وضاحت وغیر شاعری کے خواص نہیں ہیں اور ان کا ہونا کسی موزوں و مجمل تحریر کو شاعری نہیں بنا سکتا۔ اس کے علی الرغم شاعری آواز، آہنگ، سنگیت، لے، غنائیت، نغمگی اور لب ولہجہ کے ڈرامائی اتار چڑھاؤ وغیرہ کا مرکب ہوتی ہے۔ لٰہذا یہ کہنا کہ فلاں کلام نثر میں تو ہے لیکن اس میں شاعری کے خواص موجود ہیں، یہ اس کلام کا حسن نہیں بلکہ نقص ہے۔ لٰہذا، اگر علما قرآنی تکرار کے جواز میں قدما کی شاعری کی بجائے نثر کی نظیر پیش کریں تو اس پر غور وفکر کیا جا سکتا ہے کہ واقعی عبارتوں کے باہم اتصال یا تاکید مضمون کے لیے اس کا استعمال نثر کے محاسن میں شامل ہے۔ اس کے برخلاف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکثر مقامات پر یہ تکرار اہمل اور بے جوڑ ہے۔

سورہ رحمٰن کو لے لیجیے جس میں ''فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ'' (تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت جھٹلاؤ گے) کی تکرار 31 بار ہوئی ہے اور بعض جگہ بے محل واقع ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چلتے چلتے راستے پر گر پڑے اور آپ بول اٹھیں، ''سبحان اللہ''، بالکل اسی طرح اس سورہ میں کئی مقام موجود ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا تو پھر تم مقابلہ کر سکو گے۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (35-36)

پھر جب آسمان پھٹ کر تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو وہ کیسا ہولناک دن ہو گا۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (37-38)

گناہگار اپنے چہرے ہی سے پہچان لیے جائیں گے تو پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ لیے جائیں گے، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (41-42)

یہی وہ جہنم ہے جسے گناہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔ وہ دوزخ اور کھولتے ہوئے گرم کے درمیان گھومتے پھریں گے۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (43-45)

قلت ذخیرۂ الفاظ:

جیسا کہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ تکرار لفظی و معنوی دونوں فن شاعری سے مختص ہیں۔ یہاں ہم اس پر یہ اضافہ بھی کرنا چاہتے ہیں کہ تکرار سے صرف حسن ہی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اکثر جگہ اور بطور خاص نثر میں یہ قلت ذخیرۂ الفاظ کو بھی نشان زد کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ مصنف کے پاس مترادفات کی کتنی کمی واقع ہے۔ لفظی یا عبارتی تکرار کفایت شعاری ہی نہیں بلکہ قلاشی کا بھی اشارہ ہے۔ غالباً تیسری صدی کے ایک مشہور یونانی ماہر لسانیات اور نقاد Longinus نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "On the Sublime" میں کہتا ہے، "آپ کے خیالات اور تصورات خواہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں، جب تک آپ کے پاس صحیح اور موزوں الفاظ نہ ہو، آپ تحریر کو رفعت عطا نہیں کر سکتے۔"

عربی زبان جس کے ذخیرۂ الفاظ کے اکثر و بیشتر علما گن گاتے نہیں تھکتے، کیا وجہ ہے کہ قرآن اس کا استعمال کرنے سے معذور رہا؟ اینڈرسن شا نے قرآن کی اس قلاشی کو اپنے ایک گرانقدر مضمون "فان لم تستیقظوا ولن تستیقظوا" میں خوب اچھی طرح واضح کیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس پر ایک نظر ڈال لی جائے:

> قرآن کے دیگر جھولوں میں یہ بھی ہے کہ ایک ہی سورت میں ایک کہانی کو بیان کرنے والے الفاظ کو دوسری کہانی بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، جسے کہانی کا ٹیمپلیٹ کاپی کرنا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، مثال کے طور پر سورہ اعراف دیکھیے:

- آیت 60 جس میں قوم نوح کا بیان ہے:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ

- آیت 66 جس میں قوم ثمود کا بیان ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ

- آیت 90 جس میں قوم شعیب کا بیان ہے:

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ

- آیت 75 جس میں قوم صالح کا بیان ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ

- آیت 88 جس میں قوم شعیب کا بیان ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ

- آیت 109 جس میں قوم فرعون کا بیان ہے:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ

- آیت 127 اس میں بھی قوم فرعون کا بیان ہے:

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ یَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ

- آیت 61 جس میں حضرت نوح کا بیان ہے:

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ

- آیت 67 جس میں حضرت ہود کا بیان ہے:

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ

- آیت 62 جس میں حضرت نوح کا بیان ہے:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

- آیت 68 جس میں حضرت ہود کا بیان ہے:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ

- آیت 63 جس میں حضرت نوح کا قصہ ہے:

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

- آیت 69 جس میں حضرت ہود کا قصہ ہے:

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

یہ سارا عرضِ مکرر صرف ایک ہی سورت کی آگے پیچھے کی آیات میں ہے۔ ذیل میں کچھ دیگر سورتوں کی آیات کا تشابہ پیش ہے:

- سورہ اعراف آیت 83

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ

- سورہ النمل آیت 57

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ

اب سورہ اعراف کی آیت 60 سے آیت 63 تک کا ٹیمپلیٹ دیکھیے جس میں قوم نوح کا قصہ ہے:

- قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٦٠
- قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦١
- اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٦٢
- اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝٦٣

اب بالکل یہی ٹیمپلیٹ الفاظ میں معمولی سے ہیر پھیر کے ساتھ ایک اور کہانی کے لیے استعمال کیا گیا۔ آیت 66 تا 69 جس میں قوم عاد کے قصے کا بیان ہے:

- قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٦٦ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦٧ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝٦٨ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝٦٩

حیرت انگیز طور پر خدا کے پاس الفاظ کی شدید قلت ہے۔ اسی لیے وہ کبھی ایک ہی سورت میں آئی ایک کہانی کا ٹیمپلیٹ اسی سورت میں دوسری کہانی کے لیے بڑے دھڑلے سے کاپی کر لیتا ہے۔ تو کبھی کسی ٹیمپلیٹ کو کسی دوسری سورت میں پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کوئی احمق سوال نہیں اٹھائے گا کہ اس پر "مقدس" کا لیبل جو چسپاں ہے۔ یہاں ریت کے خدا کی فصاحت و بلاغت گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ اور کاپی پیسٹ کا تو پوچھیے ہی مت جس کا قرآن میں ایک انبار موجود ہے۔ ذیل میں ایک چھوٹا سا نمونہ پیش خدمت ہے:

◆ سورہ بقرہ آیت 134

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ

◆ سورہ بقرہ آیت 141

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ

◆ سورہ بقرہ آیت 147

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ

◆ سورہ آل عمران آیت 60

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ

◆ سورہ بقرہ آیت 5

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

◆ سورہ لقمان آیت 5

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

◆ سورہ بقرہ آیت 27

الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ

◆ سورہ الرعد آیت 25

وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ

◆ سورہ بقرہ آیت 162

خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ

◆ سورہ آل عمران آیت 88

خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ

◆ سورہ آل عمران آیت 11

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

- سورہ الانفال آیت 52

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

- سورہ آل عمران آیت 182

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

- سورہ الانفال آیت 51

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

- سورہ الانعام آیت 4

وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ

- سورہ یس آیت 46

وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ

- سورہ الانعام آیت 10

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

- سورہ الانبیاء آیت 41

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

- سورہ ہود آیت 96

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ

- سورہ غافر آیت 23

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ

- سورہ ہود آیت 110

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ

ۭ وَاِنَّھُمۡ لَفِیۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ

- سورہ فصلت آیت 45

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ فَاخۡتُلِفَ فِيۡهِ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّهُمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ

- سورہ الطور آیت 40

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ

- سورہ القلم آیت 46

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ

- سورہ طور آیت 41

اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ

- سورہ القلم آیت 47

اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ

- سورہ الزخرف آیت 83

فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَيَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ

- سورہ المعارج آیت 42

فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَيَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ

- سورہ الواقعہ آیت 67

بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ

- سورہ القلم آیت 27

بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ

- سورہ الحدید آیت 1

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ

- سورہ الحشر آیت 1

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ

- سورہ الصف آیت 1

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَھُوَالْعَزِیْزُالْحَکِیْمُ

- سورہ یونس آیت 48

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

- سورہ الانبیاء آیت 38

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

- سورہ النمل آیت 71

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

- سورہ سبا آیت 29

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

- سورہ یس آیت 48

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

- سورہ الملک آیت 25

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

تو یہ حال ہے اس کتاب کا جسے معجزہ کہا جاتا ہے۔ ابھی ایسے کئی اسلوبیاتی اور نحوی معجزے باقی ہیں۔ اگر قرآن کا ایک معمولی طالب علم بھی ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کر لے تو اس کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا کہ ''اعجاز القرآن'' نام کی کوئی شے وجود رکھتی ہے جس کی گذشتہ چودہ سو سالوں سے گردان جاری ہے۔

قصوں کی تکرار

قرآن میں پچھلے انبیا اور ان کی قوموں کی سرگزشتوں کی تکرار جا بجا ہے۔ ایک ہی قصہ کو مختلف سورتوں میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔ علما کے نزدیک اس کی حکمت وہی ہے جو تکرار لفظی یا عبارت کی تکرار کے ضمن میں ہے یعنی تاکید اور قارئین کو ذہن نشین کرانا۔ لیکن یہ عذر لنگ ہے، کیوں کہ ایک ہی قصے کی تکرار اکتاہٹ اور حبس کے علاوہ واقعہ کو بے جا طول دیتی ہے۔ اس تکرار کی صرف دو مثالیں حاضر خدمت ہیں:

- <u>قصہ آدم و ابلیس</u>

سورۂبقرہ: آیت نمبر 30 سے 39 تک: کل 10 آیات

سورۂاعراف: آیت نمبر 9 سے 25 تک: کل 17 آیات

سورۂبنی اسرائیل: آیت نمبر 61 سے 65 تک: کل 5 آیات

سورۂطٰہٰ: آیت نمبر 115 سے 123 تک: کل 9 آیات

سورۂص: آیت نمبر 71 سے 88 تک: کل 18 آیات

سورۂکہف: آیت نمبر 50: کل 1 آیت

- قصہ ابراہیم

سورۂبقرہ: آیت نمبر 124 سے 141 تک: کل 18 آیات

سورۂانعام: آیت نمبر 74 سے 90 تک: کل 17 آیات

سورۂتوبہ: آیت نمبر 114: کل 1 آیت

سورۂہود: آیت نمبر 69 سے 76 تک: کل 8 آیات

سورۂابراہیم: آیت نمبر 35 سے 41 تک: کل 7 آیات

سورۂمریم: آیت نمبر 41 سے 50 تک: کل 10 آیات

سورۂانبیا: آیت نمبر 51 سے 73 تک: کل 23 آیات

یہی حال فرعون و موسیٰ، عاد و ثمود وغیرہ جیسے قصوں کا ہے جن کی تکرار قارئین کے طبع نازک پر بار گراں بنتی ہے اور متن کی روانی اور اس کے حسن ایجاز کو متاثر کرتی ہے۔

انگریزی کا ایک فقرہ ہے: Details are dirty۔ اچھی نثر میں تکرار ایک بڑا عیب ہے۔ اگر ایک ہی قسم کے الفاظ بار بار دہرائے جا رہے ہوں تو لکھنے والا اپنے ذخیرۂ الفاظ کی کوتاہی کی نشان دہی کر لیتا ہے، جیسا کہ ہم گذشتہ قسط میں قرآن سے مثالیں دے کر واضح کر چکے ہیں۔ اس کے برعکس اگر لکھنے والا ایک ہی موضوع کو بار بار دہراتا ہے تو گویا وہ اپنی علمیت کے فقدان کی خبر دیتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن میں ایک ہی قصے کی تکرار جا بجا ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ جب میں کوئی لفظ ایک بار استعمال کرتا ہوں تو وہ لفظ میرے لیے مر جاتا ہے، اسی طرح ایک موضوع پر جب ایک بار قلم اٹھا لیا تو دوبارہ اسے چھونے کا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے کے پاس نئے موضوعات، محاورے، استعارے، امثال وغیرہ کی کمی ہے اور وہ محض پرانی چیزوں کی جگالی کرنے پر مجبور ہے۔ موضوع کے بغیر الفاظ سے کھیلنے کی کوئی صورت ہی نہیں رہ جاتی۔

سوال گندم جواب چنا

جیسا کہ پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ فصاحت و بلاغت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مقتضائے حال کے موافق بولا جائے یعنی سوال اور جواب دونوں آپس میں مطابقت رکھتے ہوں۔اب ذرا قرآن کی کچھ آیات ملاحظہ فرمائیں کہ سوال کچھ اور کیا جارہا ہے لیکن جواب کچھ اور دیا جارہا ہے۔

(1)سورہ بقرہ کی آیت 215 میں پوچھا جارہا ہے:

يَسْئَلُونَكَ ما ذا يُنْفِقُونَ

(تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں خدا کی راہ میں؟)

اب جواب ملاحظہ فرمائیں:

قُلْ ما أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوالِدَيْنِ وَ الْأَقْرَبِينَ وَ الْيَتامى وَ الْمَساكِينِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ وَ ما تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ

(کہہ دو کہ ہر خیر و نیکی جو تم خرچ کرتے ہو وہ ماں باپ،اقربا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے اور جو کار خیر بھی تم کرتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے)

غور کیجیے کہ پوچھا گیا تھا کہ "کیا خرچ کریں"۔لیکن جواب "کہاں خرچ کریں" کا دیا جارہا ہے، جو پوچھا ہی نہیں گیا تھا۔

(2)سورہ بقرہ ہی کی آیت 189 میں دریافت کیا گیا:

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ

(سوال کرتے ہیں تجھ سے ہلال کے بارے میں)

جلالین میں اس کی تفسیر یوں لکھی ہے کہ سوال یوں کرتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ چاند نہایت باریک ظاہر ہوتا ہے، پھر زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ پورا روشن ہو جاتا ہے، سورج کی طرح ایک ہی حالت میں کیوں نہیں رہتا یعنی چاند کے ہلال، قمر اور بدر ہونے کی وجہ پوچھتے ہیں۔

اب دیکھیے قرآن محمد کو کون سا جواب دینے کا مشورہ دے رہا ہے:

قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

(کہہ دے کہ یہ آدمیوں کے لیے وقت ہیں اور حج کے)

ظاہر ہے کہ سوال کے موافق جواب نہیں ہے اور فصاحت سے آیت نیچے گر گئی کیوں کہ یہ علم ہیئت کا سوال ہے، صاف کہہ دیا جاتا کہ ہمیں نہیں معلوم۔

(3)سورہ ذاریات کی آیت 12 میں ایک سوال اور پوچھا گیا:

يَسْئَلُونَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ

(سوال کرتے ہیں کہ قیامت کا دن کب آئے گا)

جواب اس کے فوراً بعد کی آیت 13 میں دیا گیا:

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ

(جب آگ میں گرائے جائیں گے)

سوال تو یہی تھا کہ آگ میں کب گرائے جائیں گے، کہہ دینا چاہیے تھا کہ قیامت کے دن کا کسی کو علم نہیں ہے۔

نامانوس الفاظ

جلال الدین سیوطی نے "اتقان" میں ہماری توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ قرآن میں بہت سارے ایسے غیر مانوس الفاظ شامل ہیں جن سے جید صحابہ بھی ناواقف تھے لیکن زبان نہیں کھولی، ظاہر ہے کہ جسے کلام اللہ مان چکے ہیں، وہاں دم کیسے مارا جا سکتا تھا۔ اگر قرآن کی جگہ کوئی فصیح شاعر ایسی غلطی کرتا تو اس پر غیر فصیح کا داغ لگ جاتا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ "فاطر السماوات" کے معنی میں نہ جانتا تھا، جب تک دو بدو ایک چاہ کی بابت جھگڑا کرتے ہوئے نہ آئے اور لفظ "فطرتھا" (بمعنی ابتدا) نہ بولا۔ پھر یہی ابن عباس کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ "حنانا" کیا ہے؟ پھر کہتے ہیں کہ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا کا مطلب مجھ پر نہ کھلا جب تک بنت ذی یزن سے افتح بمعنی اخاصم نہ سنا۔ ابن عباس پھر اعتراف کرتے ہیں کہ میں پورا قرآن جانتا ہوں لیکن "غلین"، "حنانا"، "اواہ" اور "رقیم" کا مطلب نہیں جانتا۔

حسن سے روایت ہے کہ ہم لوگ نہیں جانتے تھے کہ "اریکتہ" کے کیا معنی ہیں؟ جب ہمیں یمن کا ایک آدمی ملا تو اس نے بتایا کہ ان کے نزدیک اس کے معنی وہ حجلہ ہے جس میں تخت ہو۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں ان یمنی محاوروں کی فہرست پیش کر دیتا جو حجازیوں کے لیے نامانوس تھے جن کی زبان میں قرآن نازل ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ محاورے نہ حجازی ہیں اور نہ یمنی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی عبارت محتاج ہے حدیث کی، جو بغیر صحابہ اور تابعین کی تشریح و تعبیر کے بغیر نہیں سمجھی جا سکتیں۔

فقروں میں سقم

(1) بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (سورہ فاتحہ:1)

رحمٰن، رحیم کی نسبت خاص ہے اور یہ ترکیب توصیفی ہے، چنانچہ صفات میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب ترقی ہوتی ہے یعنی بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحِيۡمِ الرَّحۡمٰنِ ہونا چاہیے تھا۔اس سقم کو چھپانے کے لیے علما جو بھی تاویل کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس فقرہ میں ترتیب صفات کی رعایت سے نہیں ہے۔

(2) إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ

مسلمان خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عبارت خلاف ترتیب ہے۔استعانت کو عبادت پر مقدم کرنا چاہیے تھا۔

(3) يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ وَمَا يَخۡدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُونَ (سورہ بقرہ:9)

منافقین اللہ اور مسلمانوں کو فریب دیتے ہیں لیکن سوال اٹھتا ہے کہ اگر مسلمان اللہ کے لوگ ہیں تو انھیں فریب دینا گویا اللہ کو ہی فریب دینا ہے؛ پھر ان کو الگ الگ کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ مزید یہ کہ اللہ کو فریب دینے کے کیا معنی ہیں، یہ تو عقلاً محال ہے۔

(4) وَإِنَّ مِنَ ٱلۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ ٱلۡأَنۡهَٰرُۚ وَإِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ ٱلۡمَآءُۚ

اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے نہر پھوٹ نکلتے ہیں، اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلنے لگتا ہے۔

دونوں شقوں کا ایک ہی آل ہے، نہروں کا منبع بھی شروع میں تھوڑا پانی ہی ہوتا ہے، پھر وہ آگے بڑھتے ہوئے نہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ہے قرآن کی بلاغت کہ دونوں شقیں یکسانیت کی شکار ہو گئیں۔

(5) يَكۡتُبُونَ ٱلۡكِتَٰبَ بِأَيۡدِيهِمۡ (بقرہ:79)

اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

خدا کی کتابیں بھی ہاتھوں سے ہی لکھی جاتی ہیں یا کتابت کرائی جاتی ہیں۔ یہ آیت عجز بیانی کا شکار ہو گئی اور مدعا خبط ہو گیا۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ قرآنی فقروں میں سقم کی ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے لیکن ابھی ہمارے پاس بلاغی نقائص کے اور بھی نکات ہیں، جن پر ایک غائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے، لہٰذا چند مثالوں سے اس مغالطے میں نہیں رہنا چاہیے کہ پورے قرآن میں محض یہی گنی

چنی آیات ہیں جو ذیلی عنوانات کے تحت آتی ہیں۔

تضاد بیانی

(1) قرآن میں کافی عددی تضادات پائے جاتے ہیں، کیا اللہ معمولی حساب کتاب میں بھی اتنا کمزور ہے؟ کیا کسی قسم کی کمزوری اس کے شایان شان ہو سکتی ہے؟ مثلاً اللہ نے زمین اور آسمان کتنے دنوں میں بنائے، اس تعلق سے علم الحساب کا یہ نادر نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ....(7:54)"

"تمھارا پروردگار تو خدا ہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے..."(10:3)

"اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا...."(11:7)

مندرجہ بالا آیات صاف صاف کہہ رہی ہیں کہ اللہ نے زمین اور آسمان چھ دنوں میں بنائے لیکن مندرجہ ذیل آیات کوئی اور کہانی کہہ رہی ہیں:

"کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا...."(41:9)

"اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلبگاروں کے لیے یکساں"(41:10)

"پھر دو دن میں سات آسمان بنائے...."(41:12)

تو اب پورا حساب کچھ یوں ہوا؛ 2 دن (زمین کے لیے) + 4 دن (زمین کی آرائش اور معیشت کے لیے) + 2 دن (آسمانوں کے لیے) = 8 دن (جب کہ بار بار چھ دن میں بنانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔)

حالاں کہ یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ اللہ کو زمین اور آسمان بنانے میں چھ یا آٹھ دن کیوں لگ گئے، وہ تو قادر مطلق ہے، بس "کن" بول دیتا، پلک جھپکتے ساری چیزیں بن جاتیں۔ خیر آیئے، عددی تضادات کا دوسرا نمونہ دیکھتے ہیں۔

(2) "..... بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے رو سے ہزار برس کے برابر ہے۔"(22:47)

"جس کی طرف روح (الامین)اور فرشتے پڑھتے ہیں (اور)اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔"(70:4)

تو پھر نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ اللہ کا ایک روز زمین کے 1000 سال کے برابر ہوگا یا50000 سال کے برابر؟

(3) درج ذیل آیات سے پتہ لگائیں کہ پہلے زمین بنی یا آسمان؟ اللہ ایک آیت میں فرماتا ہے کہ اس نے پہلے زمین تخلیق کی لیکن دوسری آیت میں وہ یہ دعویٰ کرتا نظر آتا ہے کہ اس نے پہلے آسمان بنایا۔

"اللہ وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو انہیں سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز جانتا ہے۔"(2:29)

"کیا تمہارا بنانا بڑی بات ہے یا آسمان کا جس کو ہم نے بنایا ہے۔اس کی چھت بلند کی پھر اس کو سنوارا۔اور اس کی رات اندھیری کی اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔اور اس کے بعد زمین کو بچھا دیا۔"(79:27-30)

ان آیات کے آپسی تضادات سے قطع نظر کیا جدید سائنس سے یہ مفروضہ مطابقت رکھتا ہے؟ کیا آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زمین پہلے بنی اور اس کے بعد آسمان کو اللہ نے بنایا؟ کیا جدید سائنس ہمیں آسمانوں کی سات پرتوں کے بارے میں کچھ بتاتی ہے؟ دراصل "آسمان" نام کی کوئی چیز تو ہے ہی نہیں جو چھت کی طرح ہمارے سروں پر سایہ فگن ہو، آسمان تو محض خلا ہے جو چاردیواری سے آزاد ہے۔ قرآن کا یہ مفروضہ "چھت" کے قدیم تصور سے مطابقت رکھتا ہے جسے کنایتہً "آسمان" بھی کہا جاتا تھا۔ کیا آسمان کے تعلق سے یہ قرآنی تصور مضحکہ خیز نہیں ہے؟

(4) "یہ سب رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمائی اور بعضوں کے درجے بلند کیے۔۔۔۔"(2:253)

درج بالا آیت میں اللہ کہہ رہا ہے کہ اس نے اپنے رسولوں کے درمیان امتیاز کیا یعنی ہر رسول کا درجہ یکساں نہیں ہے۔ لیکن تضاد بیانی کی انتہا یہ ہے ایک دوسری جگہ یہی اللہ کہتا ہے:

"۔۔۔ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔۔۔"(2:285)

(5) "ذلك الكتاب لا ريب فيه"(اس کتاب میں کچھ شک نہیں ہے) یعنی شک کی ساری گنجائش ختم کر دی گئی ہے لیکن پھر آگے کہا جاتا ہے، "وإن كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا

(الخ)"یعنی اس کتاب کے تعلق سے کچھ لوگوں کے شک کی تائید بھی کی جارہی ہے ورنہ جواب کیوں دیا جاتا؟

(6) "وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (قیامت کے روز اللہ ان سے نہ تو کلام کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر کرے گا)۔ چلیے یہ بات طے ہوگئی کہ روز قیامت اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا لیکن پھر وہ اپنی ہی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے، "فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ" (تیرے رب کی قسم ہم ان سے سوال ضرور کریں گے)۔ پہلا کلام نفی ہے جب کہ دوسرا اثبات، جو کہ خلاف فصاحت ہے۔ اگر مدعا یہ تھا کہ اللہ فرشتوں کے توسط سے بات کرے گا تو یہاں واضح نہیں ہے، اس لیے قیاس پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ کی قسم

اللہ تعالٰی قسمیں بہت کھاتے ہیں۔ حالاں کہ قسم فی نفسہ اللہ کی عظمت کے منافی ہے، کیوں کہ قسم وہ کھاتا ہے جو اپنی ذات کو حقیر سمجھتا ہے اور جس کو اپنی بات کی صداقت اور اس کی تاثیر پر یقین نہیں ہوتا۔ قرآن میں قسمیں توحید، رسالت اور قیامت وغیرہ جیسے بنیادی ستونوں کے ذکر پر اکثر کھائی گئیں ہیں، اگرچہ ان امور میں قسم کھانا بے سود ہے، کیوں کہ اس سے نہ مخالف کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ موافق کو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے علاوہ اپنے مخلوق کی قسمیں بھی کھائی ہیں، لیکن قسم تو ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو قسم کھانے والے سے زیادہ بلند مرتبہ کا حامل ہو۔ پھر سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ خدا کے لیے غیر اللہ کی قسم کھانا کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟

علما اس اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ قرآن کا اپنا ایجاد کردہ اسلوب نہیں ہے بلکہ دور جاہلیت میں یہ اسلوب مستعمل تھا اور وہ اس کی سند جاہلیہ کے اشعار سے دیتے ہیں، مثلاً:

وبالکلات والعزی ومن دان دینھا

وباللہ ان اللہ منھن اکبر

[لات وعزی اور ان کے مذہب اختیار کرنے والوں کی قسم اور خدا کی قسم، اللہ ان سب سے بڑا ہے۔] (اوس بن حجر)

حلفت باللہ ان اللہ ذو نعم

لمن یشائ وذو عفوو تصفاح

[میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ جس چیز پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور وہ عفو و درگذر کرنے والا ہے۔](عبید بن الابرص)

حلفت فلم اترك لنفسك ريبة

وليس وراء الله للمرئ مذهب

[میں نے قسم کھائی اور تمھارے لیے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ چھوڑی اور اللہ کے سوا آدمی کے لیے کوئی مذہب نہیں ہے۔](نابغہ ذبیانی)

اول تو یہ کہ میں پہلے ہی مقدمہ میں تفصیلی طور پر عرض کر چکا ہوں کہ ادب الجاہلی کے اشعار جعلی ہیں جنھیں ظہور اسلام کے بعد کہا گیا اور انھیں جاہلیہ کے شعرا سے منسوب کر دیا گیا، تاکہ قرآن کے نقائص کا دفاع کیا جا سکے۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ درج بالا اشعار اصلی ہیں تو یہ اسناد ہی غیر متعلقہ ہیں، کیوں کہ یہ انسانی کلام ہیں جس میں متکلم خود سے برتر چیز کی قسمیں کھا رہا ہے اور اسے اپنی بات کا گواہ بنا رہا ہے، جب کہ قرآن میں اللہ خود کی یا پھر اپنے سے کمتر شے کی یعنی اپنی مخلوق کی قسمیں کھا رہا ہے۔ علما اس کا جواز یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں قسم اس لیے کھائی گئی ہے تاکہ مقسم علیہ کی تاکید ہو سکے اور مخاطب کے شک و شبہ کو دور کیا جا سکے۔ لیکن پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ قسم وہی کھاتا ہے جس میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے اور جسے اپنی ہی بات پر یقین نہیں ہوتا۔ خود قرآن نے قسم کھانے والوں کی مذمت کی ہے اور کچھ زیادہ ہی سختی اور حقارت سے کی ہے۔

وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ(سورہ قلم:10)

[اور کسی ایسے شخص کے کہے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل اوقات ہے۔]

لیکن افسوس ہمیشہ کی طرح اللہ میاں کو اپنی کہی ہوئی بات یاد نہیں رہی اور اس طرح میاں جی کی جوتی میاں جی کے سر پر ہی پڑ گئی۔ ذرا ان قسموں کے تواتر اور گونا گونی کو ملاحظہ فرمائیں:

- وَالۡفَجۡرِ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ وَالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ وَالَّيۡلِ إِذَا يَسۡرِ هَلۡ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجۡرٍ(سورہ فجر:1-5)

[فجر کی قسم اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب جانے لگے اور بے شک یہ چیزیں عقل مندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں۔]

- وَالۡمُرۡسَلَٰتِ عُرۡفًا فَالۡعَٰصِفَٰتِ عَصۡفًا وَالنَّٰشِرَٰتِ نَشۡرًا فَالۡفَٰرِقَٰتِ فَرۡقًا فَالۡمُلۡقِيَٰتِ ذِكۡرًا(سورہ مرسلات:1-5)

[ہواؤں کی قسم جو نرم نرم چلتی ہیں، پھر زور پکڑ کر جھکڑ ہو جاتی ہیں اور (بادلوں کو) پھاڑ کر پھیلا دیتی ہیں، پھر ان کو پھاڑ کر جدا جدا کر دیتی ہیں، پھر فرشتوں کی قسم جو وحی لاتے ہیں...]

- وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهَـٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (سورہ التین: 1-4)

[انجیر کی قسم اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر کی کہ ہم نے انسانوں کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔]

- وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا (سورہ عادیات: 1)

[ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں۔]

- يسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ (سورہ یٰسین: 1-2)

[یٰسین۔ قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے۔]

- وَالصَّافَّاتِ صَفًّا فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا إِنَّ إِلَـٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (سورہ صافات: 1-4)

[صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی قسم ہے، پھر جھڑک کر ڈانٹنے والوں کی، پھر ذکر الٰہی کے تلاوت کرنے والوں کی، البتہ تمھارا معبود ایک ہی ہے۔]

- وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ (سورہ بروج: 1-2)

[آسمان کی قسم جس میں برج ہیں، اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔]

اسی طرح سورۂ مدثر 33,34؛ سورۂ تکویر 17,18؛ سورۂ انشقاق 17 وغیرہ مختلف آیات میں زمانوں کی قسم کھائی گئی۔ سورۂ طور، سورۂ تین، سورۂ بلد اور دوسری آیات میں مقدس مقامات کی قسم کھائی گئی ہے۔ واضح رہے کہ مقسم علیہ کی مختلف شکلیں بھی قرآن میں موجود ہیں؛ توحید، اثبات رسالت، قرآن کی حقانیت، قیامت، تحکیم رسول وغیرہ جیسے بنیادی موضوعات جنھیں کفار مذاق کا اکثر و بیشتر نشانہ بنایا کرتے تھے، اللہ نے قسمیں دے دے کر انھیں یقین دلانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ تردید و انکار، عناد و اختلاف اور مناظرہ و مجادلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دلیل و برہان کی جگہ "قسم" کو دفاعی اسلحہ کے طور پر استعمال کیا جو اکثر کمزور، نہتے، جھوٹے، کمتر اور خود اعتمادی سے محروم لوگوں کا اکلوتا سہارا ہوتا ہے، جو صرف صاحب متن کو ہی نہیں بلکہ متن کو بھی اعجاز کے مرتبہ

سے نیچے گرادیتا ہے۔

تخاطب

قرآن کا اسلوب تخاطب حد درجہ ناقص ہے، حالاں کہ قرآن فہمی کے لیے یہ ناگزیر ہے، جب کہ جہت خطاب کی تبدیلی اور اس کے عموم و خصوص سے بڑی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اور اس صورت میں قرآن کا فہم اور اس کی معرفت دشوار ہو جاتی ہے۔

قرآن میں جب خطاب واحد سے ہوتا ہے تو اکثر وہاں کوئی صریح اور واضع قرینہ موجود نہیں ہوتا، نتیجتاً قاری حیران و پریشان افہام و تفہیم کے صحرا میں بھٹکتا رہتا ہے۔اس ضمن میں کچھ مثالیں اینڈرسن شانے اپنے مضمون میں دی ہیں، جو اس مسئلے کو جزئیاتی طور پر سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

اب نمونے کے طور پر یہ آیت دیکھیے جس میں بظاہر خدا ابلیس سے مخاطب ہے:

"قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ" (سورہ اعراف:12)

یہاں "قال" میں ضمیر کس کی طرف ہے؟ خدا نے اس کا ذکر اس طرح کیوں کیا جیسے وہ کسی اور کے بارے میں بات کر رہا ہو؟ مسئلہ سمجھ میں آیا؟ لگتا ہے یہ مثال کافی نہیں تھی، چلیے کوئی اور آیت پکڑتے ہیں تاہم یاد رہے کہ سارا قرآن خدا کی زبانی ہے:

أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّا ٱللَّهَ ۚ إِنَّنِى لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ۙ (سورہ ہود:2)

کیا معاملات اس سے بھی زیادہ واضح ہو سکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے "اننی لکم منه نذیر وبشیر"؟ یہاں "اننی" میں ضمیر کس کی طرف ہے؟ زیادہ ٹینشن نہ لیں، میں بتاتا ہوں کہ "اننی" میں ضمیر کس کی طرف ہے۔ یہاں "اننی" میں ضمیر محمد کی طرف ہے۔اوپر بھی وہی خدا اور ابلیس کا قصہ سنا رہے تھے اور یہاں بھی وہی یہ وعظ کر رہے ہیں۔ کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ قرآن خدائی پیغام ہے یا انسانی تصنیف؟

اس کے علاوہ جو کتاب قرآن کے نام سے ہم پر تھوپ دی گئی ہے، اس میں بہت ساری تعبیری، نحوی اور بلاغی غلطیاں موجود ہیں۔ جس سے بجا طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ایک انسانی خرافات کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً خدا کہتا ہے: "إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسْتَحْىِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا" (سورہ بقرہ: 26) جبکہ بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے: "بعوضه فما اصغر" کیونکہ یہ کہنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ خدا

دقیق مثالیں استعمال کرتا ہے نہ کہ بر عکس! ورنہ یوں کیوں نہیں کہتا کہ: ''فیلاً فما فوق''؟

ایک اور مثال سیاق کے عدم تسلسل کی ہے جیسے: ''اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ''(سورہ فاطر: 10) جبکہ بلاغی تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ''الیه یصعد الکلام الطیب والعمل الصالح'' کیونکہ ''یرفعه'' زیادہ یا فالتو ہے جس کی ضرورت نہیں۔ یا پھر یہ دیکھیے: ''وَّ لَا تَسۡتَفۡتِ فِیۡهِمۡ مِّنۡهُمۡ اَحَدًا''(سورہ کہف: 22) یہاں ''فیهم منهم'' کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خدائی منطق ہے؟ نحوی طور پر تو بات ہی مت کریں اور یہ ایک چلتے چلتے حاضر خدمت ہے: ''وَ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً''(سورہ بقرہ: 80) جو کہ غلط ہے۔ نحوی طور پر ''ایاماً معدودات'' درست ہے۔

قِران وو صل

عطف کے ساتھ یا بغیر عطف کے دو الفاظ یا متصل جملوں کو ایک ساتھ لانا قِران کہلاتا ہے۔ لیکن قرآن میں اس صنعت کا استعمال دو مقابل معانی والے الفاظ کو یکجا کر کے بھی کیا گیا ہے جو نقص اسلوب ہے۔ مثلاً العزیز الغفار، العزیز الرحیم، العزیز الحکیم، العزیز العلیم وغیرہ کی صفات دیکھیں جن میں کافی بُعد ہے۔ کہاں اقتدار و حاکمیت کا تصور اور کہاں رحمت و حکمت اور علم کا تصور؟ اس فرق اور تفاوت کو کوئی بھی صاحب بصیرت دیکھ سکتا ہے، مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

حشو وزوائد

نثر ہو یا نظم حشو بہر حال عیب ہے۔ یعنی کلام میں ایسا لفظ جس کو اگر نکال دیا جائے تو بھی وہ کلام مکمل ہوتا ہو اور معنی کی پوری ترسیل ہوتی ہو۔ اسے صنعت اعتراض بھی کہتے ہیں۔

عروض، قافیہ وردیف کی مجبوری کی وجہ سے بعض وقت شاعر ایسے الفاظ استعمال کر جاتا ہے جو حشو وزوائد میں شمار ہوتے ہیں، لیکن نثر میں ان سے بآسانی بچا جا سکتا ہے کہ یہاں کوئی شعری مجبوری نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی شاعر کسی غزل کا قافیہ وردیف ''مکان میں ہے''، ''جہان میں ہے'' وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ''درمیان میں ہے'' کہہ دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ ''درمیان'' کے قافیہ

کے ساتھ ''میں'' کی ضرورت نہیں، لہٰذا یہ حشو ہے لیکن شاعرانہ مجبوری ہے جس سے چاہ کر بھی شاعر نہیں بچ پاتا۔ اس کے بر خلاف نثر میں ''میں'' بآسانی حذف کیا جا سکتا ہے، جیسے ''دونوں کے درمیان معاہدہ طے پایا'' وغیرہ۔

قرآن کے اسلوب کا المیہ یہ ہے کہ اس میں صرف غیر ضروری الفاظ ہی نہیں بلکہ غیر ضروری عبارتیں بھی اصل متن کی سلاست وروانی کو مجروح کرتی ہیں، جنھیں اگر نکال دیا جائے تو مافی الضمیر پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی معنی کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ علما نے ان حشو زوائد کو ''جملۂ معترضہ'' سے تعبیر کرتے ہوئے آیات کی تزئین اور تاکید کا جواز پیش کیا ہے لیکن اول تو ''صنعت معترضہ'' شاعری کی صنعت ہے، نثر کی نہیں اور دوم یہ کہ نثر وضاحت اور منطقی جواز سے عبارت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خراب نثر شعر کے قریب ہوتی ہے۔ ایک اچھے شاعر کو تو خود یہ نہیں پتہ ہوتا ہے کہ اگلا شعر وہ کیا کہنے والا ہے لیکن نثر لکھنے والے کی فکر طے شدہ ہوتی ہے، نہ کہ مصرع طرح پر کہی جانے والی غزل ہوتی ہے۔ نثر کی دوسری بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تکلف و تصنع سے عاری ہوتی ہے۔ فٹ پاتھی دوا فروشوں، مداریوں اور حکایات بے سند سنانے والے مولویوں کی باتیں دلچسپی سے سنی تو جا سکتی ہیں مگر ان پر یقین کرنے والا دھوکا کھاتا ہے۔ گویا نثر کی خوبی یہ ہے کہ یہ سنی سنائی پر ایمان نہیں لاتی بلکہ پکی تحریر کا تقاضا کرتی ہے، ایسی تحریر جو گنجلک اور مبہم نہ ہو۔ ابہام بھلے ہی شعر کے لیے حسن کا درجہ رکھتا ہو، نثر کے لیے عیب ہے۔ اسی طرح شعر میں تعقید شاعرانہ مجبوری کا نام ہے کہ بحر کے تقاضے پورے کرنے کے شاعر الفاظ کو آگے پیچھے کرنے پر مجبور ہوتا ہے مگر نثر میں تعقید بہت بڑا عیب ہے۔ ممکن ہے کہ مبالغہ یا معترضہ شاعری کا حسن ہو لیکن نثر میں انھیں عیب اور حشو وزوائد کی قطار میں ہی شمار کیا جائے گا۔

قرآن سے اس عیب یعنی حشو وزوائد کی کچھ مثالیں حاضر خدمت ہیں:

- وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ

(صافات:158-160)

[اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ حالاں کہ جنات جانتے ہیں کہ وہ (خدا کے سامنے) حاضر کیے جائیں گے۔ یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، خدا اسے پاک ہے۔ مگر (بجز) خدا کے خاص بندوں (کے)]

ان آیات میں ''سُبْحَنَ ٱللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ''کا فقرہ حشو ہے،اس فقرے کے بغیر بھی بات مکمل ہو جاتی ہے۔

- فَسُبْحَنَ اللهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ (روم:17-18)

[تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو خدا کی تسبیح کرو۔اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی تعریف ہے۔اور تیسرے پہر بھی اور جب دوپہر ہو]

ان آیات میں اوقات تسبیح (عبادت) کے درمیان وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ کا فقرہ غیر متعلقہ ہے جو احکام کی روانی میں حارج ہے۔

- وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُونَ (انعام:100)

[اوران لوگوں نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرایا، حالاں کہ ان کو اسی نے پیدا کیا۔اور بے سمجھے اس کے لیے بیٹے بیٹیاں تراشیں وہ ان باتوں سے جو اس کی نسبت بیان کرتے ہیں پاک ہے۔]

یہاں وَخَلَقَهُمْ کی ضرورت نہیں تھی،اس کے بغیر بھی بات مکمل ہے اور معنی کی پوری ادائیگی کر رہی ہے، چنانچہ یہ حشو ہے۔

- فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ ٱلنُّجُومِ وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُۥ لَقُرْءَانٌ كَرِيمٌ فِى كِتَٰبٍ مَّكْنُونٍ واقعہ:75-78)

[ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم،اور اگر تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے، کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے،کتاب محفوظ میں۔]

ان آیات میں وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ حشو ہے۔

قرآن میں ایسے حشو وزوائد کی کثرت ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ چھوٹے فقروں تک ہی یہ عیب محدود نہیں ہے بلکہ طویل مضامین بھی بطور حشو قرآن میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ اعراف کو ہی لے لیجیے۔ حضرت موسیٰ کی داستان بیان ہو رہی ہے اور اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا (آیت نمبر 156) پھر اگلی آیت میں انبیا کے خصائص پر تقریر شروع ہو گئی (157)،اس کے فوراً بعد کی آیت

میں محمد کا ذکر شروع ہو گیا اور لگے ہاتھوں ان پر ایمان لانے کی دعوت بھی دے ڈالی گئی (158) لیکن اس آیت کے بعد U-Turn لے کر دوبارہ اصل مضمون کی طرف واپسی ہو گئی اور موسیٰ کی ادھوری داستان کو مکمل کرنے کی سرگرمی جاری ہو گئی۔

دوسری مثال سورۂ مریم کی لے لیں۔ آیت نمبر 16 سے 33 تک مریم کی سرگذشت بیان ہوئی ہے، یہ سلسلہ عیسیٰ کے ارشادات تک جاری رہتا ہے لیکن درمیان میں دو آیات 34 اور 35 دخل در معقولات کے تحت اللہ نے ڈال دیے۔ پھر ان دو آیات کے بعد عیسیٰ کے ارشادات کا آخری ٹکڑا شامل کر دیا گیا۔ اگر ایسی بے ربط اور حشو و زوائد سے پُر کلام کو کوئی فصاحت و بلاغت کا معیار قرار دیتا ہے اور اس کی جواز جوئی کے لیے تاویلیں گڑھتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ کلام الٰہی کی بجائے اسے انعام کا حقدار قرار دینا چاہیے کہ اس نے قبح کو حسن ثابت کرنے کا عظیم اور نادر فریضہ انجام دیا ہے۔

محذوف عبارتیں

جس طرح حشو و زوائد کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کو مجروح کرتے ہیں، اسی طرح غیر ضروری حذف سے کلام عجز بیانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ نظم میں ابہام و ایہام اس کا حسن ہے لیکن نثر وضاحت کی متقاضی ہوتی ہے، یہاں علائم، استعاروں اور کنایوں میں گفتگو معائب سخن میں شمار ہوتا ہے۔ قرآن میں متعدد ایسی محذوف عبارتیں ہیں جو انھیں سلاست سے گرا دیتا ہے، کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں:

1. فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ (ہود:109)

اس آیت میں "کما کان یعبد" کی بجائے "کما یعبد" کہا گیا ہے یعنی "کان" حذف کر دیا گیا ہے۔

2. وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (زخرف: 6-7)

اس آیت میں بھی خط کشیدہ فقرے کو دیکھیں، کیا یہاں "وما کان یاتیھم" ہونا چاہیے تھا۔

3. وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ (انعام:75)

اس آیت میں "کنّا نریٰ ابراھیم" ہونا چاہیے تھا۔

4.وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ(ہود:37-38)

ان آیات میں "یصنع" سے پہلے "جعل "یعنی فعل ماضی محذوف ہے۔

5.وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ(حشر:9)

اس آیت کو یوں ہونا چاہیے تھا؛"نبوو الدار و احکمو الایمان"(احکمو کو حذف کر دیا گیا)۔

6.وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ(نحل:15)

کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل عبارت یوں تھی، "فجر فیھا انھارا و مد فیھا سبلاً"۔اس کا جواز یہ پیش کیا گیا ہے کہ یہ افعال بغیر اظہار کے ظاہر تھے یعنی غیر ضروری تھے،اس لیے حذف کر دیے گئے۔

7.وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (نسا:36)

اس عبارت کی ترتیب یوں ہونی چاہیے "اعبدو اللہ و احسنوا بالوالدین "۔

8.فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (آل عمران:61)

خط کشیدہ ٹکڑے کو یوں ہونا چاہیے؛"نَدْعُ نحن أَبْنَاءَنَا و انتم أَبْنَاءَكُمْ و نحضر وَأَنفُسَنَا و انتم أَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ نحن و انتم"۔

9.أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِۦ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْقَٰسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ ٱللَّهِ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ (زمر:22)

اس آیت کو یوں ہونا چاہیے؛أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِۦ ۚ یستویٰ من قسی قلبہ فَوَيْلٌ لِّلْقَٰسِيَةِ قُلُوبُهُم ۔

10.إِن تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ(تحریم:4)

محولہ بالا آیت کو یوں ہونا چاہیے؛ان تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فھذا اجدیٰ بکما لانہ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا

وَإِن تَظَٰهَرَا عَلَيْهِ فَلا یضر انه لان الله هو مولاه۔

نحوی غلطیوں کی کچھ اور مثالیں:

اگرچہ اس باب میں ذیلی عنوانات کے تحت قرآن کی کچھ نحوی غلطیوں کا ضمناً تذکرہ ہو چکا ہے لیکن یہ فہرست چونکہ کافی طویل ہے تو میں اس کی کچھ اور مثالیں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

(1) قَالُوٓاْ إِنْ هَٰذَٰنِ لَسَٰحِرَٰنِ يُرِيدَانِ أَن يُخْرِجَاكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ ٱلْمُثْلَىٰ (طٰہٰ:63)

اس آیت میں إِنْ هَٰذَٰنِ کی بجائے إِنْ هَٰذَيْنِ ہونا چاہیے، کیوں کہ اسم "ان" کا تعلق "یا" اور "نون" سے ہے جب کہ یہاں "الف اور نون" سے منصوب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام النسفی کے مطابق حضرت عمر إِنْ هَٰذَيْنِ ہی پڑھتے تھے۔

(2) إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَادُواْ وَٱلصَّٰبِـُٔونَ وَٱلنَّصَٰرَىٰ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (مائدہ:69)

اس آیت کا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ٱلصَّٰبِـُٔونَ اسم ہے جو واؤ اور نون کے ساتھ مرفوع ہے، جب کہ اسے "یا اور نون" کے ساتھ منصوب ہونا چاہیے یعنی "الصائبین"۔ اس نحوی سقم کی توضیح کے لیے سورہ بقرہ کی آیت نمبر 62 سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(3) قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى ٱلظَّٰلِمِينَ (بقرہ:124)

اس آیت میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہاں ٱلظَّٰلِمُونَ کا محل ہے کیوں کہ یہ فاعل جمع مذکر سالم ہے جو فعل "ینال" کے ساتھ مربوط ہے، چنانچہ یہاں واؤ اور نون کی بجائے "یا اور نون" آنا چاہیے۔

(4) لَّٰكِنِ ٱلرَّٰسِخُونَ فِى ٱلْعِلْمِ مِنْهُمْ وَٱلْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ ۚ وَٱلْمُقِيمِينَ ٱلصَّلَوٰةَ ۚ وَٱلْمُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلْمُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ أُوْلَٰٓئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا (نسا:162)

گرامر کے اعتبار سے یہاں المومنون اور الموتون کی مناسبت سے المقیمون درست ہوتا۔

(5) وَٱلْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَٰهَدُواْ ۖ وَٱلصَّٰبِرِينَ فِى ٱلْبَأْسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلْبَأْسِ ۗ أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُواْ ۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُتَّقُونَ (بقرہ:177)

اہل زبان فیصلہ کرلیں کہ کیا یہاں والصابرون بر محل نہیں ہوتا؟

(6) لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ

اس آیت میں وَأَسَرُّوا کی بجائے وَأَسَرَّ ہونا چاہیے تھا۔

صفت حاضر، اسم غائب

صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفًا وَالنَّاشِرَاتِ نَشْرًا فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا عُذْرًا أَوْ نُذْرًا (سورہ مرسلات:1-6)

[ہواؤں کی قسم جو نرم نرم چلتی ہیں، پھر زور پکڑ کر جھکڑ ہو جاتی ہیں، اور (بادلوں کو) پھاڑ کر پھیلا دیتی ہیں، پھر ان کو پھاڑ کر جدا جدا کر دیتی ہیں، پھر فرشتوں کی قسم جو وحی لاتے ہیں، تاکہ عذر (رفع) کر دیا جائے یا ڈر سنا دیا جائے۔]

یہاں موصوف کا تذکرہ غائب ہے، جو ثقہ مفسرین کے درمیان اختلاف رائے کو جنم دینے کا موجب بنا۔ ان آیات کی تفسیر میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے تمام آیات کو ہوا پر محمول کیا جس کی ترجمہ میں رعایت رکھی گئی ہے اور بعض لوگوں نے اس سے ملائکہ کو مراد لیا اور کچھ لوگوں نے تفریق کی ہے۔ ابن کثیر نے مرسلات اور عاصفات سے ہواؤں کو اور آگے کی آیات سے ملائکہ کو مراد لیا ہے۔ یہ اختلاف محض اس لیے ہے کہ محولہ بالا آیات عجز بیانی کا شکار ہو گئی ہیں یعنی اپنا مافی الضمیر ادا کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ چلیے ایک دوسری مثال بھی دیکھ لیتے ہیں۔

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا (عادیات:1-5)

[قسم ہے ان کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر چنگاریاں جھاڑتے ہیں، پھر صبح سویرے چھاپا مارتے ہیں، پھر اس موقع پر گرد و غبار اڑاتے ہیں، پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں۔]

یہاں بھی اسم کا پتہ نہیں، صفت حاضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں عام قارئین تو درکنار مفسرین بھی اسم کا پتہ لگانے میں قیاس آرائیوں کا سہارا لیتے نظر آتے ہیں۔ پھر مفسرین ہی

کیوں، عالی مرتبت صحابہ کے درمیان بھی اختلاف نظر آجاتے ہیں۔ علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، محمد بن کعب اور ابو صالح اس سے مراد ''اونٹ'' لیتے ہیں لیکن عبداللہ بن عباس، حسن اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں گھوڑے مراد ہیں۔اونٹ اور گھوڑوں سے قطع نظر یہاں دیکھنے والی بات اتنی ہے کہ یہ اختلاف ان لوگوں کے درمیان ہے جن کی قرآن فہمی پر شک نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس کے باوجود یہ ابہام قائم رہتا ہے تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ متن واضح نہیں ہے۔ فکر کی وضاحت و مہارت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب متعین کلمات کا انتخاب کیا جائے، ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن میں معنی کا اشتراک پایا جاتا ہو بلکہ وہی الفاظ منتخب کیے جائیں جو مفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہوں، اس لیے مترادفات میں جو باریک فرق ہوتا ہے، اسے بھی ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے۔ قصر و تفخیم، اہمیت وافادیت، تاکید و تنظیم کے لیے تقدیم وتاخیر کے قواعد کا پاس رکھنا بھی لازمی ہے۔اور سب سے ضروری یہ ہے کہ کلام کے عناصر ترکیبی ایک ماہرانہ نظام اور مرتب تنظیم سے جڑے ہوں تاکہ قارئین کو مختلف اجزا کے باہمی تعلقات ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو اور متن کی گرہ کشائی میں بے جا قیاس آرائیاں نہ کرنی پڑیں۔ لیکن افسوس قرآن اسلوب کے ان بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے جس کے بغیر اعجاز فصاحت کا دعویٰ تو دور کی بات ہے، اس کے ایک اوسط درجہ کے کلام ہونے پر بھی شک کرنا کوئی بری بات نہیں۔

قرآن کی بے نظیری کے اسباب

اتنا سب کچھ کہنے کے بعد اگر میں یہ کہوں کہ قرآن من حیث المجموع اپنی نوعیت کی اکلوتی کتاب ہے تو اس پر بانسوں اچھلنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی یہ حیران ہونے کا مقام ہے۔ عرض مدعا صرف اتنا ہے کہ قرآن کو بے نظیری کی جو سند ملی ہے، وہ اس لیے نہیں کہ اس کا مقابلہ و موازنہ دوسری کتابوں سے کر کے معاصرین نے اسے یہ مقام دیا ہے بلکہ اس لیے کہ میدان میں جو دوسرے دلاور تھے، وہ گذر گئے اور قرآن تنہا رہ گیا۔ ظاہر ہے جب وہ اکیلا ہے تو مقابلہ و معارضہ ممکن نہیں۔ قرآن نے مقابلہ کر کے میدان نہیں جیتا، بلکہ حسن اتفاق سے اس نے میدان کو خالی پایا اور سہرا اس کے سر بندھ گیا۔ ان ایام کا جنھیں ہم زمانہ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں، اس زمانے کا عرب لٹریچر ناپید ہو گیا۔ چنانچہ ایسی بے نظیری اہل علم ودانش کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

قدیم عربی لٹریچر ناپید

شروع اسلام اور اس سے سو برس قبل عربوں میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایک احساس تفاخر پایا جاتا تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ایک فصیح شخص جماعت کثیر کو صرف اپنی قدرت کلام کے زور پر روک لیتا تھا اور جس طرف چاہے، جھونک دیتا تھا۔ لیکن افسوس کہ سوائے ان سات معلقات کے اور کوئی معلقہ نظر نہیں آتا بلکہ آج ادب اور انشائے عرب کی کوئی تصنیف اسلام سے سو برس پہلے کی نہیں ملتی، کچھ تو عمداً اور کچھ بے اعتنائی کا شکار ہو گئیں۔

عربی زبان شیوع اسلام کے وقت پکی عمر کو پہنچ چکی تھی اور اس کے ادب و انشا معنی بیان صرف و نحو و عروض سب کے قواعد منضبط ہو چکے تھے۔ یہ ہماری اردو زبان کی طرح بتدریج ترقی نہیں کر رہی تھی بلکہ یونانی، لاطینی اور سنسکرت کی طرح بن چکی تھی۔

عربوں کے قدیم تمدن کی بابت تاریخ عالم اس درجہ خاموش نہیں ہے جیسی وہ ان قدیم تمدنوں کے متعلق ہے جنھیں حال کی تحقیقات نے آثار قدیمہ کے گرد و غبار میں سے کھود کر نکالا ہے۔ اگر تاریخ پوری ساکت بھی رہتی تو بھی ہم بآسانی ثابت کر سکتے تھے کہ یہ تمدن محمد کے زمانہ

سے بہت پہلے موجود تھا۔اس ضمن میں صرف اتنی یاددہانی کافی ہوتی کہ محمد کے وقت میں بھی عرب میں ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اوراس زبان میں تصنیفات موجود تھیں، حتیٰ کہ اعراب جاہلیت نے دو ہزار سال سے دنیا کی مہذب ترین اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر لیے تھےاور آخری سو برس سے توانھوں نے ایسی ترقی کی تھی جسے منجملہ حیرت انگیز ترقیوں میں شمار کرنا چاہیے جن کی یادگار اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ ایک اعلیٰ زبان اور اس میں تصنیفات دفعتاً پیدا نہیں ہو سکتیں، چنانچہ ان کا وجوداس بات کی دلیل ہے کہ اس قوم نے ایک زمانہ دراز طے کیا ہے۔

اب میں یہاں دوبارہ پوچھتا ہوں کہ عرب کا وہ قدیم عالیشان تمدن اوراس کا علمی اثاثہ کہاں غائب ہو گیا؟ عرب کی فصاحت وبلاغت کے نمونے کہاں ہیں، جن سے معارضہ ومقابلہ کرنے کے لیے قرآن آسمان سے زمین پر اترا تھا؟ اگر اس زمانے کے ناموروں کے کلام کے مختلف نمونے ہمارے پاس ہوتے جیسے یونان،روم یاہندوستان کے سلف کا گراں مایہ کلام ہمارے ہاتھوں میں ہے، توبے شک ان کے مقابلے سے یہ بات پرکھی جاسکتی تھی کہ قرآن کو کمال فوقیت حاصل تھی یا نہیں اور یہ بھی طے ہو جاتا کہ اس زمانہ میں جو قواعد فصاحت وبلاغت ومعانی وبیان کے مسلمہ تھے،ان کے لحاظ سے قرآن کا مرتبہ کیا تھا۔اس کے قواعد کیا تھے،یہ ہمیں معلوم ہی نہیں اور جو معلوم ہیں،وہ ایسے لوگوں کے ذریعہ معلوم ہیں جو مسلمان تھے اور ایسے وقت میں ہوئے جب زمین وآسمان بدل چکے تھے، جب تمدن پلٹ چکا تھااور انقلاب سارے پرانے آثار مٹا چکا تھا۔ سلاطین عباسیہ کے عہد میں نئے قواعد منضبط ہوئے جس میں ہر طرح قرآن کی رعایت رکھی گئی اور اسے ایسے لوگوں نے مرتب کیا جو قرآن کو بطورعقیدہ ایک آسمانی کتاب اور کامل تسلیم کر چکے تھے۔ان کی تحقیق آزاد نہ تھی بلکہ جانب دار تھی جو نہ جاہلیت اوراسلام کے درمیان انصاف کرنا جانتے تھے اور نہ ہی وہ اس قابل رہے تھے۔ لہٰذا ہمیں تسلیم کرناپڑے گا کہ عروج کے وقت اسے فصیح وبلیغ ماننے والا کوئی نہ تھااور جسے کوئی فصیح وبلیغ نہ مانتا تھا، وہ فصیح وبلیغ بن گیا۔ جولوگ آج قرآن کو فصیح وبلیغ مانتے ہیں، اگر وہ ایک پل کے لیے اس زمانہ میں جا کھڑے ہوں جو دس برس تک اسلام نے مکہ میں دیکھا اور معاصرین کی آنکھوں سے عکاظ کی محفلیں دیکھیں توآنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں اور یہ راز افشا ہو جائے کہ معاصرین قرآن کو بے قدری کی نگاہ سے کیوں دیکھتے تھے اور کیوں اسے قابل التفات نہیں سمجھا۔ وجہ صاف ہے کہ اس زمانہ میں اسباب فیصلہ موجود تھے، جاہلیت کا کلام ان کے پیش نظر

تھا، چنانچہ اہل عصر کو قرآن اس معیار پر نہیں جچا اور وہ اسے حقارت سے دیکھتے رہے۔ وہ جن کے پاس اس زمانہ میں معیار کلام کی کسوٹی موجود تھی، انھوں نے قرآن کو اپنے قواعد کے خلاف پایا۔

مسلمانوں کو لازم تھا کہ علم فصاحت و بلاغت میں فصحائے عرب کی وہ تصنیفات جو قرآن کے مقابلے پر تھیں، انھیں سب کے سامنے پیش کرتے اور ان کی کسوٹی، ان کے قواعد سے قرآن کا مقابلہ کرکے دکھاتے۔ لیکن مسلمانوں نے بددیانتی یہ کی کہ ان تمام کتابوں کو ضائع کر ڈالا اور خود قرآن کے معتقد بن کر اور اسے کلام اللہ فرض کرکے یہ یقین کر لیا کہ خدا سے زیادہ کون فصیح ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے موافق انھوں نے قواعد اور اصول فصاحت بلاغت مرتب کر دیے جس کا ذکر تفصیلی طور پر پہلے کیا جا چکا ہے۔

ممکن ہے کہ معترضین اور قرآن کے مداح کہیں کہ اگر قرآن کی فصاحت عرب کے فصحا اور بلغا کے قواعد کے خلاف ہوتی تو کم از کم یہود و نصاریٰ اسے ضرور محفوظ رکھتے بلکہ اس کی پوری دنیا میں تشہیر کرکے قرآن کا مذاق اڑاتے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کتابوں کے مصنفوں کے نام بھی دریافت کریں۔

اس کا جواب میں پہلے بھی دے چکا اور بار بار دے چکا ہوں کہ مسلمانوں نے تو انسانوں کو نہیں چھوڑا، دیوان اور قصیدے کیسے چھوڑ دیتے؟ ورقہ بن نوفل، ابن رشد، رازی، فارابی، الکندی، ابوالعلا المعری وغیرہ کی کتنی کتابیں آپ کے پاس موجود ہیں؟ مسیلمہ بن حبیب کا وہ قرآن کہاں موجود ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن کے مقابلے میں جھوٹا تھا؟ اگر واقعی وہ جھوٹا تھا تو اسے ضائع کیوں کر دیا، رہنے دیا ہوتا تاکہ اہل نظر دونوں قرآن کا موازنہ کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے۔ جب میدان میں قرآن ہی اکیلا رہ گیا تو جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کیوں کر ممکن ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ریس میں اکیلا دوڑنے والا خود کو اول انعام کا مستحق قرار دے دے۔

جاہلیہ کی کتابیں چھوڑیں، آپ نے تو اسلام کے زمانے کی کئی کتابوں کو گم کر ڈالا۔ آپ نے سارا کتب خانہ صحف قرآن کا جو خلیفہ عثمان کے عہد تک تیار ہو چکا تھا، آن کی آن میں خاکستر ہو جانے دیا۔ کسی غیرت مند مسلمان نے کسی ملک میں کوئی صحیفۂ قرآن بچا نہ رکھا، پھر بھی ہم سے یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ ہم گمشدہ کتابوں کا پتہ بتائیں؟ گمشدہ کتابوں کو تلاش کرنے کا شوق ہے تو پھر عبداللہ بن مسعود کا صحیفۂ قرآن، علی کا جمع کیا ہوا قرآن، ورقہ بن نوفل کی الکتاب العربی، لقمان کا

صحیفہ حکمت اور وہ مابین الدفتین جو خود محمد نے بطور ترکہ چھوڑا تھا، انہیں ڈھونڈیں اور ہمیں بھی مہیا کرائیں۔

اہل فارس میں علوم عقلیہ کا خاص رواج تھا اور اس معاملے میں ان کا دامن کافی وسیع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ علوم فارس ہی سے یونان پہنچے تھے۔ لیکن تاریخ میں یہ شرمناک واقعہ بھی موجود ہے کہ جب مسلمانوں نے فارس کا علاقہ فتح کیا اور یہاں بے شمار کتابیں پائیں تو سعد بن ابی وقاص سپہ سالار لشکر نے خلیفہ عمر کو ان کتابوں کے بارے میں خط لکھ کر پوچھا کہ کیا یہ کتابیں مسلمانوں کے لیے منتقل کرلی جائیں؟ عمر نے جواب میں لکھا کہ ''انہیں سمندر میں غرق کردو۔ کیوں کہ اگر ان میں ہدایت ہے تو حق تعالیٰ نے ہمیں ان سب سے زیادہ ہدایت والی کتاب عطا فرمادی ہے اور اگر ان میں گمراہی ہے تو ہمیں اللہ کافی ہوگیا ہے۔'' آخر کار یہ تمام کتابیں پانی میں ڈال دی گئیں اور ان کے ساتھ ساتھ اہل فارس کے علوم بھی ختم ہوگئے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں، مقدمہ ابن خلدون، حصہ دوم، ص 316)

پھر عرب اور فارس ہی کیوں، مسلمانوں کی علم دشمنی کا جغرافیہ تو کافی بڑا ہے۔ اسکندریہ کی لائبریری کی بربادی ہو یا فاطمین مصر کے دور میں قاہرہ کے قصر شاہی کا عدیم النظیر کتب خانہ جسے صلاح الدین ایوبی نے جلا کر خاکستر کردیا۔ 420 ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے رے فتح کیا تو وہاں کے کتب خانوں کو جلادیا۔ اسلامی دنیا کے سب سے پہلے عمومی کتب خانہ میں جسے ابو نصر شاپور وزیر بہاالدولہ نے 381 ہجری میں بغداد کے محلہ کرخ میں قائم کیا تھا، اس کتب خانے میں دس ہزار سے زائد ایسی کتب تھیں جو خود مصنفین یا مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ اس کتب خانہ کو مورخین نے ''دارالعلم'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ یہ مایہ ناز کتب خانہ 451 ہجری میں طغرل بیگ سلجوقی نے جلادیا۔ 586 ہجری میں ملک المؤید نے نیشاپور کے باقی ماندہ کتب خانوں کو جلا کر تباہ کردیا۔

کتاب اور علم دشمنی کی ایسی شاندار روایت شاید ہی کسی دوسری قوم میں ملے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود مسلمان ہم سے ایک ہزار سال پہلے کی وہ کتابیں طلب کرتے ہیں جو جاہلیہ سے منسوب ہیں۔

رہی بات یہود و نصاریٰ و کفار کی تو یہ عذر بھی بے کار ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کی حفاظت کیوں نہ کی، سوال پیدا ہوتا کہ جب جان اور ایمان کے لالے پڑے ہوں، وہاں کتب خانوں کی

حفاظت کا سودا کسے دامن گیر ہو سکتا ہے؟ ذرا انصاف کریں کہ مدینہ میں یہودیوں کے سینکڑوں علما اور شعرا موجود تھے اور سینکڑوں برس سے وہاں آباد تھے، وہ اپنے ہی دینی لٹریچر کی حفاظت نہ کر سکے اور صدیوں کا لکھا ایک آن میں برباد ہو گیا۔

ایک سادہ سا کلیہ یہ ہے کہ جو عبارت نوک زبان بن جائے، زبان پر رواں ہو جاتی ہے اور اس کی یہ روانی اسے فصاحت کے درجہ پر فائز کر دیتی ہے۔ اسی لیے ضرب المثل سب سے فصیح کلام سمجھا جاتا ہے۔ قرآن ایک ایسی قوم کی مذہبی کتاب تھی جو اپنا سابقہ لٹریچر برباد کر چکی تھی۔ مدتوں اس کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہیں رہی، جس کا پڑھنا برکت سمجھا جاتا تھا، جسے یاد کرنا عزت اور بچوں کو رٹانا خدمت تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا، لوگ اس کی تسبیح پھیرنے لگے؛ اب نثر تھی تو قرآن اور نظم تھی تو قرآن۔ قرآن کے علاوہ اس قوم کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا، لہٰذا مسلمانوں کا سارا علم ایک زمانے تک قرآن تک محدود رہا، حافظ قرآن ہو جانا ایک کمال تھا جو دنیا و دین میں آدمی کو آبرومند بناتا تھا۔ لہٰذا جب قرآن نوک زبان کیا گیا تو سب سے فصیح تر ہو گیا، وہ ایک ضرب المثل بلکہ اس سے بھی زیادہ بن گیا۔ غلط العام فصیح بھی تو ایک مثل ہے۔ مختصر یہ کہ کسی زبان کے جو الفاظ، محاورات اور فقرات روزمرہ میں داخل ہو کر عام بول چال میں استعمال ہونے لگتے ہیں، وہ کثرت استعمال سے صیقل ہو ہو کر زبان خلق پر چڑھ جاتے ہیں، پھر وہ ابتدا میں خواہ کیسے بھی ہوں، خواہ کیسے ہی ثقیل اور غیر فصیح رہے ہوں، رفتہ رفتہ فصاحت کے رتبہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ابوالعلا معری جس کا ادب ضرب المثل ہے، وہ زبان کے اس فطری قانون سے خوب واقف تھا اور قرآن کی حقیقت بھی اس پر کھلی ہوئی تھی۔ اس نے بھی قرآن کے معارضہ میں ایک قرآن لکھا تھا۔ جب کسی نے اس سے کہا کہ تمھاری کتاب فصیح و بلیغ تو ہے لیکن اس میں قرآن سی روانی نہیں ہے۔ ابوالعلا معری نے اس شخص کو کثرت استعمال کے اسی قانون کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: صبر کرو، چار سو سال گذر جانے دو، جب یہ بھی منبر پر پڑھ پڑھ کر زبانوں پر قابض ہو جائے گی تو دیکھ لینا۔

لہٰذا قرآن فصیح نہیں بلکہ غلط العام فصیح ہے، پھر اس کے پڑھنے کے لیے قواعد تراشے گئے اور خوش الحانی مستزاد کی گئی، غرض کہ اسے وہ زینت عطا کی گئی جو اس میں موجود نہ تھی۔ مسلمانوں کے کان اس زینت سے مانوس ہو چکے ہیں، اس لیے انھیں وہ عظیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب دوسرے لوگ اسے صرف ایک عربی کتاب سمجھ کر ہاتھ میں لیتے ہیں اور اسے مصنوعی تزئین سے علیحدہ کر کے پڑھتے ہیں، اس پر فلسفیانہ رائے قائم کرتے ہیں تو اس میں حیران ہونے کی ضرورت

نہیں کہ وہ مسلمانوں کی رائے پر صاد نہیں کرتے۔

قرآن کی اصلاح

قرآن کے کئی عیوب جواب تک قرآن میں موجود ہیں،ان پر تفصیلی بات ہو چکی ہے، لیکن ایک بات رہ گئی کہ قرآن کے کئی عیوب کی اصلاح بھی عمل میں آچکی ہے۔پہلے تو قرآن کے حامیوں نے انھیں عیوب تسلیم ہی نہیں کیا لیکن جب شور زیادہ بڑھا تو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور ہزاروں کو چھانٹ کر نکال ڈالا۔یہ عیوب زبان سے متعلقہ تھے جو شاید فصحائے عرب کا مضحکہ بن گئے تھے اور یوں الم نشرح ہو گئے تھے کہ ان کا قرآن میں موجود رہنا فتنہ کا باعث ہوتا۔یہ نقائص عبارت اور انشا کے تھے۔قرآن کی اس اصلاح کا کام حضرت عثمان نے اس نامور کمیٹی کے سپرد کیا تھا جو قرآن پر نظر ثانی اور اس کی تالیف کے لیے بٹھائی گئی تھی۔اس کمیٹی کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ قرآن کی عربیت کو درست کرے۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن میں ایک نہایت ہی معروف اور معتبر حدیث ہے کہ عثمان نے حکم دیا زید بن ثابت، سعد بن عاص، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن حارث کو کہ جہاں تمھارے درمیان قرآن کی عربی میں اختلاف ہو جائے تو اسے قریش کی زبان میں لکھو، کیوں کہ قرآن انھی کی زبان پر نازل ہوا ہے۔لہٰذا، انھوں ویسا ہی کیا۔اب اس سے صاف صاف روشن ہے کہ قرآن کی عربیت ناقص تھی اور اس کی اصلاح ان چار اشخاص نے اپنے علم و واقفیت کی بنیاد پر کر دی۔اس میں بہت سے الفاظ، عبارات اور محاورات وغیرہ قریش کی زبان کے خلاف تھے۔ اصلاح کرنے والوں سے جتنا ممکن ہو سکا، انھیں قریش کی زبان سے قریب تر کر دیا اور جو چیزیں ناقابل اصلاح تھی، انھیں ترک بھی کر دیا۔

اس کی مثال کچھ یوں دی جا سکتی ہے کہ فرض کریں کہ دہلی کا کوئی بزرگ ایک کتاب لکھے جس میں زبان کے اعتبار سے کافی سقم ہوں۔اس میں بعض محاورات پنجابی ہوں، بعض بنگالی ہوں، کچھ مراٹھی ہوں جو زبان کا لطف زائل کرنے کا محرک بنتے ہوں۔ پھر ایک زمانہ گذر جانے کے بعد اس بزرگ کے مریدین نے کوئی کمیٹی اس غرض سے بلائی کہ اس کتاب پر نظر ثانی کی جائے۔اس کمیٹی میں جو اہل زبان موجود ہوں، وہ اس بات پر اتفاق کر لیں کہ ہمارے بزرگ تو خاص دہلی شہر کے باشندے تھے، ان کی زبان اردوئے معلیٰ تھی اور یہ کتاب بھی دہلی والوں کے لیے ہی لکھی گئی تھی، لہٰذا، جہاں بھی اس اعتبار سے زبان کا نقص ملتا ہے، اسے رفع کر دینا چاہیے۔اس میں جو غلطیاں رہ گئی

ہیں، وہ اس لسان العصر بزرگ سے منسوب نہیں کی جاسکتیں۔ اس اقدام کے بعد ممکن ہے کہ وہ کتاب اپنے اصل سے زیادہ افضل ہو جائے گی۔ کچھ اسی قسم کی اصلاح و تصحیح عثمان نے بھی قرآن میں کر دی جس پر ابن مسعود اور ابی بن کعب اور دیگر صحابہ نے کافی واویلا مچایا۔ اس اصلاح و تصحیح کے بعد بھی جو اغلاط قرآن میں باقی رہ گئے ہیں، ان کو امتداد زمانہ، کثرت استعمال اور خوش اعتقادی نے غلط العام فصیح کے رتبہ پر فائز کر دیا۔ اس طرح ''ہر عیب کہ سلطان پسند ہنر است'' کے مصداق قرآن کو عربی زبان کا سلطان قرار دے دیا گیا، اور اس طرح اس کے معائب محاسن میں بدل گئے۔

مآخذ

- قرآن
- تفسیر کبیر: امام فخر الدین رازی
- تفسیر بغوی: حسین بن مسعود بغوی
- تفسیر مدارک: علامہ النسفی
- تفسیر عزیزی: شاہ عبد العزیز دہلوی
- نظم القرآن: جاحظ
- الاتقان فی علوم القرآن: جلال الدین سیوطی
- اعجاز القرآن: قاضی ابو بکر باقلانی
- اعجاز القرآن: مصطفیٰ صادق رافعی
- تفہیمات الٰہیہ: شاہ ولی اللہ دہلوی
- کشف الظنون: ابن خلدون
- سیرت ابن ہشام: ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب حمیری
- سیرت حلبیہ: علامہ علی ابن برہان الدین حلبی
- احادیث: مسلم، بخاری، ابن داؤد
- تاریخ طبری: امام ابن جریر طبری
- الملل والنحل: شہرستانی
- وفیات الاعیان: ابن خلکان
- الکامل فی التاریخ: ابن اثیر

- اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ: ابن اثیر
- کتاب الاغانی: ابوالفرج اصفہانی
- تاریخ ابوالفدا: ابوالفدا اسماعیل بن علی بن محمود
- طبقات فحول الشعرا: ابن سلام
- تاریخ افکار و علوم اسلامی: علامہ راغب الطباخ
- تفسیر القرآن: سر سید احمد خاں
- خطبات احمدیہ: سر سید احمد خاں
- الکلام: سر سید احمد خاں
- تبیین الکلام: سر سید احمد خاں
- تہذیب الاخلاق: سر سید احمد خاں
- تدوین قرآن: مولانا مناظر احسن گیلانی
- ادب الجاہلی: ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری
- خزینتہ الادب: شیخ عبدالقادری
- تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن: اکبر مسیح
- ماہنامہ "الندوہ": ابوالحسن علی ندوی
- تمدن عرب: ڈاکٹر گستاؤلی بان
- علم شرح، تعبیر اور تدریس متن: مرتبہ پروفیسر نعیم احمد
- معجزہ اور قرآن: اینڈرسن شا
- قرآن اور دعوائے بلاغت: اینڈرسن شا
- جرات تحقیق

قرآن

اور اس کے مصنفین

سیّد امجد حسین

جرأت تحقیق
Jurat-e-Tehqiq